قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1983

اس پرچہ میں

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی-گلبرگ-۲-لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون	بدل اشتراک
۳ تین روپے	۸۸۰۸۰۰	سالانہ
	خط و کتابت	پاکستان -/۳۶ روپے
	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	غیر ممالک -/۸۶ "
شمارہ ۷	جولائی ۱۹۸۳ء	جلد ۳۶

فہرست

۱- لمعات	۲ - ۸
۲- "ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں" محترم پرویز صاحب	۹ - ۳۰
خطاب بتقریب جشنِ نزولِ قرآن	
۳- قرآنی درس کے اعلانات	۳۱ - ۳۲
۴- نگہِ بازگشت (رہگذرِ طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل) ..	۳۳ - ۴۷
۵- نظریۂ ضرورت کا اسلام	۴۸ - ۵۷
۶- روزہ کے احکام	۵۸ - ۶۱
۷- حقائق و عبر :- ۱- بادشاہت اور اسلام	۶۲ - ۶۴
۲- یورپی اور افریقی ممالک میں اسلام کی تبلیغ	
۳- ناجائز کس طرح جائز ہو جاتا ہے۔	
۴- قرآن مجید کی برکات	

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت: ۲۵-بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس۔ ۹۔ ایبک روڈ۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں

طلوع اسلام کی حالیہ اشاعت میں ایک مقالہ آپ کی نظروں سے گزرے گا جس کا عنوان ہے "نظریۂ ضرورت کا اسلام" اس میں بتایا گیا ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اور ان کے اتباع میں ان کی جماعت کا پیش کردہ اسلام کس طرح ان کی مصلحتوں کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ اس میں ایک شق یہ بھی ہے کہ مودودی (مرحوم) نے پہلے یہ کہا کہ امت مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک جماعت ہے۔ اس کے اندر جماعتیں بنانا جائز نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد پھر اپنی ایک جماعت متشکل کی اور اس کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے گئے۔ وہ مقالہ لکھا جا چکا تھا کہ اس جماعت کے ایک نامور مفسرِ قرآن مولانا گوہر الرحمان صاحب کا ایک بیان سامنے آیا جس سے صرفِ نظر کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ملاحظہ فرمائیے:-

مولانا گوہر الرحمان نے کہا ہے کہ اسلام میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں پر کوئی پابندی نہیں ہے وہ دورہ تفسیر کے پندرھویں روز جامعہ منصورہ میں خطاب کر رہے تھے۔ شیخ التفسیر مولانا گوہر الرحمان نے کہا کہ موجودہ دور میں کچھ ایسے دانشور سامنے آئے ہیں جو کہتے ہیں کہ اسلام جماعت سازی کا مخالف ہے انہوں نے کہا کہ اسلام میں جماعت بنانے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو جماعت سے الگ ہو گیا اس کی مثال اس بھیڑ جیسی ہے جو گلے سے الگ ہو گئی اور شیطان اس کے لئے بھیڑیا ثابت ہو گا۔ انہوں نے کہا اسلام ان جماعتوں کا مخالف ہے جو خدا کی زمین پر فساد پھیلانے والی ہوں اور ان جماعتوں کے قیام کا حامی ہے جو نیکیوں کی اشاعت اور برائیوں کی روک تھام کے لئے قائم کی جائیں۔ مولانا گوہر الرحمان نے کہا جس طرح کمیونسٹ حکمران اپنے ملک میں کمیونزم کی مخالف جماعتوں کی اجازت نہیں دیتے ایسے ہی اسلامی حکومت میں سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات کی اشاعت کے لئے سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کیلئے کام کرنے والی ایک سے زیادہ جماعتوں کے قیام میں کوئی حرج نہیں اس صورت میں لوگ انتخاب کرتے وقت دیکھ لیں گے کہ کون سی جماعت اسلام کے لئے زیادہ مخلص ہے اور زیادہ تندہی سے عوام کی خدمت کر رہی ہے اور کون سی کم مخلص ہے اور عوام کی خدمت سے پہلو تہی کر رہی ہے۔ مولانا گوہر الرحمان نے صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے مطالبہ کیا کہ جن جماعتوں نے قرآن و سنت کی بنیاد پر اپنے منشور قائم کئے ہیں انہیں فی الفور بحال کر

دیا جائے اور جو جماعتیں پاکستان کی اساس کی مخالف ہیں انہیں ہرگز پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔

(بحوالہ جنگ (لاہور) مورخہ ۱۶-۶-۸۳)

مولانا صاحب نے سب سے پہلے یہ فرمایا ہے کہ "موجودہ دور میں کچھ ایسے دانشور سامنے آئے ہیں جو کہتے ہیں کہ اسلام جماعت سازی کا مخالف ہے"۔ مولانا صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ان دانشوروں میں سرفہرست "مودودی (مرحوم) کا نام ہے جنہوں نے آج سے بہت پہلے فرمایا تھا کہ اسلام جماعت سازی کا مخالف ہے"۔ (ملاحظہ ہو مرحوم کی کتاب — "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ اوّل (چھٹا ایڈیشن۔ ص۵۳)۔ کیا مولانا گوہر الرحمان صاحب فرمائیں گے کہ مودودی (مرحوم) کا یہ ارشاد، اسلام کے مطابق تھا یا اس کے خلاف؟

۲۔ مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ

اسلام میں جماعت بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ مولانا صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اسلام میں جماعت بنانے کا حکم کس نے دیا ہے۔ کہاں دیا ہے۔ اس کی سند، اتھارٹی یا حوالہ کونسا ہے؟ ان حضرات کا اکثر انداز ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسلام کے معاملہ میں یہ اپنے آپ کو خود سند سمجھتے ہیں۔

مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ اسلام میں جماعت بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ مودودی (مرحوم) نے جب جھوٹ بولنے کا دروازہ کھولا تھا تو فرمایا تھا کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ "واجب ہونے" کا مطلب یہ ہے کہ ایسے مقامات پر مسلمان کو اس کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ چاہے تو جھوٹ بولے اور چاہے نہ بولے۔ ایسے مقامات پر جھوٹ بولنا واجب ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس سے گناہ ہوگا کیونکہ واجب کا ترک کرنا گناہ کا مستوجب ہوتا ہے۔

اسی طرح مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ اسلام میں جماعت بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان اپنی الگ پارٹی نہیں بناتے وہ اسلام کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں اس لئے معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

لہٰذا، جن لوگوں نے ابھی تک اپنی الگ پارٹی نہیں بنائی یا کسی پارٹی میں شامل نہیں ہوئے وہ خود سوچ لیں کہ (مولانا صاحب کے پیش کردہ) اسلام کی رو سے ان کا مقام کونسا ہے؟

ہم نہیں کہہ سکتے کہ مولانا صاحب کے نزدیک "حکم دینے والے" سے کون مراد ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک تو اسلام میں حکم دینے والا خداوند تعالیٰ ہے۔ آیئے دیکھیں کہ اس احکم الحاکمین نے امتِ مسلمہ میں پارٹیاں بنانے کے متعلق کیا کہا ہے۔

(۱) سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو "ایک امت" کہا ہے۔ ارشاد ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا...... (۲/۱۴۳)۔ "اس طرح ہم نے (یعنی خدا نے) تمہیں ایک امت بنایا ہے"۔ (ان آیات میں ہم صرف اس نکتہ کو نمایاں کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک امت قرار دیا ہے)۔

دوسری جگہ ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ...... (۳/۱۰۹)، تم وہ بہترین امت ہو جسے

نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ غور فرمایئے! اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو ایک امت۔ ایک جماعت قرار دیا ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح کر دی کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ..... (۳/۱۰۳) "تم سب کے سب۔ تمام کے تمام، اجتماعی طور پر، اللہ کی رسّی کو تھامے رکھو"۔ اس آیت میں اعتصام بحبل اللہ کے ساتھ جَمِيعًا کی تخصیص یہ واضح کر رہی ہے کہ تمام مسلمان ایک جماعت کے افراد ہیں، جسے امت مسلمہ کہا جاتا ہے۔

اس امت میں تفرقہ پیدا کرنے کو خدا نے شرک قرار دیا ہے فرمایا، وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱-۳۲) - "مسلمانو! دیکھنا (تم ایمان لانے کے بعد) مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور اپنی الگ پارٹی بنا لی۔ (پارٹی بازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برسرِ حق ہونے کا کوئی خارجی معیار نہیں رہتا، ہر پارٹی اپنے اپنے مسلک پر مگن ہو کر بیٹھی رہتی ہے اور اس طرح ان پارٹیوں میں مستقلاً تفرقہ رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تفرقہ اور اختلاف کو عذابِ عظیم کا مستوجب قرار دیا ہے۔ فرمایا: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۵)۔ "اے مسلمانو! دیکھنا تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح تعلیم آجانے کے بعد باہمی اختلاف کیا اور اس طرح فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔ ان کا یہ تفرقہ اور اختلاف شدید عذاب کا مستوجب ہو گا"۔ اس کے بعد ہے کہ یہ چیز ان کے لئے روسیاہی کا موجب ہو گی۔ ان سے کہا جائے گا کہ یہ اس لئے ہے کہ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (۳/۱۰۵-۱۰۶)۔ "تم نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا۔ یہ عذاب اسی کفر کا نتیجہ ہے"۔

غور کیجئے۔ قرآن نے امت میں تفرقہ (فرقہ بندی۔ پارٹی بازی) کو شرک کہا ہے۔ کفر سے تعبیر کیا ہے اور روسیاہی اور عذابِ عظیم کا موجب بنایا ہے۔

ٹھہریئے! رُکئے اور سینہ پر ہاتھ رکھ کر سنئے کہ فرقے پیدا کرنے والوں اور پارٹیاں بنانے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد کیا ہے۔ اس نے رسول اللہ کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ..... (۶/۱۶۰)

جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کریں اور ایک الگ پارٹی بنا لیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

غور کیجئے: فرقہ بندی اور پارٹی بازی کو خدا نے کفر اور شرک قرار دیا۔ اس لئے ایسے لوگوں کا خدا سے کوئی تعلق نہ رہا۔ اور اس کے بعد، خدا کے فیصلہ کی رُو سے، ان کا رسول سے بھی کوئی واسطہ نہ رہا۔ یہ الفاظ بڑے سخت دکھائی دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہم جو فرقہ بندی اور پارٹی سازی میں تھوڑی تھوڑی تک دو دبے ہوئے ہیں، ہم پر یہ الفاظ بڑے گراں گزریں گے لیکن الفاظ ہمارے نہیں یہ ارشادات خداوندی ہیں جو اس کی کتاب میں موجود ہیں۔ آیات کے حوالے ہم نے دیدیئے ہیں۔ آپ خود قرآن کھول کر دیکھ لیجئے کہ اس میں یہ آیات ہیں یا نہیں۔

ان سے بھی سخت تر الفاظ دیکھئے۔ مدینہ میں ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ وہ مسجد نہیں "خدا اور رسولؐ کے دشمنوں کی پناہ گاہ" ہے۔ چنانچہ خدا کے اس فیصلے کی رُو سے، رسول اللہؐ نے حکم دیا اور صحابہؓ نے

اسے آگ لگا کر مسمار کر دیا۔ اس مسجد میں کون سی ایسی خرابی تھی جس کی وجہ سے اس کا یہ انجام ہوا؟ اس خرابی کو خود خدا نے یہ کہکر واضح کر دیا کہ وہ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ (۹/۱۰۷) کا موجب تھی۔ یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی موجب۔ آپ نے دیکھا کہ امت میں تفرقہ پیدا کرنا کتنا بڑا جرم ہے کہ جس مسجد سے تفرقہ پیدا ہوتا ہوا اسے مسمار کر دینے کا حکم ہے!

ایک اور واقعہ!... حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے قوم سے الگ ہوئے اور حضرت ہارونؑ کو ان کی نگہبانی کیلئے مامور کیا۔ واپسی پر دیکھا کہ قوم، گوسالہ کی پرستش کر رہی ہے۔ حضرت موسیٰؑ جلال میں آ گئے اور بھائی (حضرت ہارونؑ) سے کہا کہ یہ کچھ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا، اور آپ نے انہیں روکا نہیں۔ حضرت ہارونؑ نے کہا کہ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو ان میں اختلاف پیدا ہو گیا سو میں نے بات آگے نہ بڑھائی۔ اس لئے کہ إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي (۲۰/۹۴) "مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ تم آکر یہ نہ کہو کہ میں نے قوم میں تفرقہ پیدا کر دیا اور آپ کا انتظار نہ کیا"۔ اس سے حضرت موسیٰؑ مطمئن ہو گئے۔ غور کیجئے۔ یہ جواب دینے والا بھی نبی ہے اور اس سے مطمئن ہو جانے والا بھی نبی۔ ان کے نزدیک قوم میں تفرقہ پیدا ہو جانا ایسا خطرناک عمل تھا کہ اس سے بچنے کے لئے گوسالہ پرستی جیسا شرک، وقتی طور پر برداشت کر لیا گیا۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، خدا نے تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے۔ تفرقہ بھی شرک تھا اور گوسالہ پرستی بھی شرک۔ لیکن اول الذکر شرک اس قدر زیادہ تباہ کن تھا کہ اس سے بچنے کے لئے کم تر درجہ کا شرک گوارا کر لیا گیا۔ اس (کم تر درجہ کے) شرک کے اثرات تو حضرت موسیٰؑ کی تلقین سے زائل ہو گئے لیکن تفرقہ کے شرک کے عواقب قوم کو تباہ کر دینے کا موجب بن جاتے، جیسا کہ بنی اسرائیل کے ساتھ بعد میں ہوا۔

آپ کو معلوم ہے کہ فرعون کا وہ کون سا ناقابل اصلاح جرم تھا جس کی پاداش کے لئے حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کو مامور کرنا پڑا؟ اسے خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر بنی اسرائیل قوت پکڑ گئے تو وہ اس کی حکومت کے لئے بہت بڑے خطرہ کا موجب بن جائیں گے۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے اس نے وہی تدبیر اختیار کی جو مستبد حکمرانوں کا عام سیاسی حربہ ہوتا ہے۔ یعنی وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴) وہ ان میں پارٹیاں بناتا رہتا تھا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑا کر کمزور کرتا رہتا۔ پارٹیاں بنانا سیاست فرعونی تھی۔

مولانا گوہر الرحمان صاحب کا ارشاد ہے کہ اسلام میں جماعت بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس آپ نے دیکھ لیا کہ اسلام میں جماعت سازی (پارٹیاں بنانے) کے متعلق کیا حکم ہے؟

مولانا صاحب ایک قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اسلام میں جماعت بنانے کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جو جماعت سے الگ ہو گیا اس کی مثال اس بھیڑ جیسی ہے جو گلے سے الگ ہو گئی اور شیطان اس کے لئے بھیڑیا ثابت ہو گا۔

اس کے معنی واضح ہیں کہ مولانا صاحب کے نزدیک اسلام کا حکم یہ ہے کہ امت کے اندر الگ پارٹی بنائی جائے پھر جو اس پارٹی سے الگ ہو جائے اسے شیطان دبوچ لے گا۔ مولانا صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے جو مثال دی ہے، وہ کس کا ارشاد ہے۔ اور وہ کس مقصد کے لئے دی گئی ہے۔ احادیث نبویؐ اور آثار صحابہؓ میں تمسک بالجماعت کی بڑی تاکید آئی ہے اور مندرجہ بالا مثال انہی میں سے ایک ہے۔

مذہب انفرادی مسلک کا نام ہے لیکن اسلام جماعتی زندگی کا ضابطہ ہے۔ اس لئے افراد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی ہیئتِ اجتماعیہ کے ساتھ منسلک رہیں۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں جو وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا کا حکم دیا گیا ہے اس سے اُمت کی یہی اجتماعی زندگی مراد ہے۔ قرآن اُمت کی اس ہیئتِ اجتماعیہ پر بڑا زور دیتا ہے کہ اسلام نام ہی اجتماعی زندگی کا ہے۔ یہ نہ رہے تو اسلام، دین نہیں رہتا، مذہب بن جاتا ہے۔ اس لئے وہ افراد سے تاکید کرتا ہے کہ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۹/۱۱۹)۔ صادق بننا چاہتے ہو تو گروہ صادقین کے ساتھ مل کر رہو۔ یہی مفہوم ہے وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۲/۴۳) کا۔ یعنی قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکو، جھکنے والوں کے ساتھ مل کر۔ اس نے تو جنت میں داخل ہونے کی بھی شرط یہ بتائی ہے: فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۙ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹/۲۹-۳۰)۔ "میرے بندوں کے ساتھ مل جا اور یوں جنت میں داخل ہو جا"۔ وہ اس اجتماعی زندگی کی اہمیت ان الفاظ میں اجاگر کرتا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳/۱۹۹)۔ "اے افرادِ مومنین! تم میں سے ہر شخص دین کی بنیادوں پر ثابت قدم رہے، اور دیگر افراد مومنین کی ثابت قدمی کا ذریعہ بنے اور اس طرح ربط باہمی سے، بازوؤں میں بازو ڈال کر، ایک جماعت کی حیثیت سے سفرِ حیات طے کرے"۔ اسلامی زندگی اسی کا نام ہے۔ ایک امت۔ اس کا ایک ضابطہ حیات۔ اور اس کی بنیادوں پر ایک اجتماعی نظام۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ لا اسلام الا بالجماعة۔ "جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا"۔ ظاہر ہے کہ "جماعت" سے مراد امت کا اجتماعی نظام ہے جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جائے گا۔ اسی کی تشریح میں حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد مروی ہے:-

قال (صلی اللہ علیہ وسلم) انی امرکم بخمس اللہ امرنی بھن۔ الجماعة۔ والسمع و الطاعة والھجرة۔ والجھاد فی سبیل اللہ۔ انہ من خرج من الجماعة قید شبر فقد خلع ربقة الاسلام من عنقہ الا ان یراجع۔ ومن دعا بدعوی جاھلیة فھو من اھل جھنم۔ قالوا یا رسول اللہ! وان صام وصلی۔ قال وان صلی وصام وزعم انہ مسلم۔

حضورؐ نے فرمایا۔ میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت۔ سمع۔ طاعت ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین جانو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا۔ اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی زندگی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضورؐ! (کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا) خواہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو؟ فرمایا۔ ہاں۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپکو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔

ایک اور روایت میں حضورؐ نے فرمایا:-

من فارق الجماعة فمات میتة الجاھلیة

جو جماعت سے الگ ہوا، وہ جاہلیت کی غیر اسلامی موت مرا۔

دوسری جگہ ہے۔ ید اللہ علی الجماعة۔ من شذ شذ فی النار۔ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے اللہ خود اس کا محافظ ہوتا ہے۔ جو جماعت سے الگ ہوا سیدھا جہنم میں گیا۔

جس مثال کو مولانا گوہر الرحمان صاحب نے درج فرمایا ہے اسے حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے آپ نے فرمایا:۔

ایاکم والتفرقہ۔ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب الا! من دعا الی ھذا الشعار فاقتلوہ ولوکان تحت عمامتی ھذا۔[1]

تفرقے سے ہمیشہ بچنا۔ کیونکہ جو انسانوں سے الگ رہتا ہے اسے شیطان دبوچ لیتا ہے جیسے اس بھیڑ کو بھیڑیا دبوچ لے جو گلہ سے الگ ہو جائے۔ یاد رکھو، جو شخص (جماعت سے الگ ہو جانے کی) زندگی کی طرف بلائے اُسے قتل کر ڈالو خواہ وہ سر میرے اس عمامہ کے نیچے ہی کیوں نہ ہو (معاذ اللہ)

آپ ان روایات پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا ان سے مراد اسلام کے اجتماعی نظام کے ساتھ متمسک رہنے کی تاکید ہے۔ یا (جیسا کہ مولانا صاحب کا ارشاد ہے۔ ان میں) یہ کہا گیا ہے کہ اُمت میں اپنی الگ جماعت بناؤ اور پھر اس جماعت کے ساتھ رہو۔ جو اس سے الگ ہو گا وہ جاہلیت کی کافرانہ موت مرے گا اور سیدھا جہنم میں پہنچ جائے گا؟ مولانا صاحب کی یہ تفسیر و حقیقت مودودی (مرحوم) کے ایک ارشاد کی صدائے بازگشت ہے۔ (آپ اس مضمون میں جس کا حوالہ پہلے دیا گیا ہے۔ یعنی "نظریہ ضرورت کا اسلام" میں دیکھیں گے کہ) مودودی (مرحوم) نے کہا تھا کہ مسلمانوں کے اندر سے نکل کر اپنی الگ جماعت بناؤ، لیکن اس جماعت کے اندر دوسری جماعت نہ بناؤ۔ اس کے ساتھ رہو۔

مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ

اسلام اُن جماعتوں کے قیام کا حامی ہے جو نیکیوں کی اشاعت اور برائیوں کی روک تھام کے لئے قائم کی جائیں۔

لیکن قرآن کریم نیکیوں کی اشاعت (امر بالمعروف) اور برائیوں کی روک تھام (نہی عن المنکر) کا فریضہ ساری امت کا قرار دیتا ہے، نہ کہ امت کے اندر مختلف جماعتیں بنا کر اُن کا فریضہ۔ اس کا ارشاد ہے "کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ" (۳/۱۱۰)۔ تم ایک بہترین امت ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ اور یہ فریضہ اُمت کے اجتماعی نظام کے ذریعے ادا ہو گا، نہ کہ الگ الگ پارٹیاں بنا کر۔ سورہ الحج میں اُمت مسلمہ کے متعلق ہے کہ "اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ" (۲۲/۴۱)۔ "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو گا تو یہ اقامت صلوٰۃ۔ ایتائے زکوٰۃ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض ادا کریں گے"

---

[1] ان سطور کے لکھتے وقت اتفاق سے ہمارے سامنے وہ کتابیں نہیں جن سے ان روایات کے حوالے درج کئے جاتے۔ ہم نے انہیں ایک اپنے سابقہ مضمون سے نقل کیا ہے۔ ویسے یہ روایات بہت مشہور ہیں۔

مولانا صاحب کے بیان کے آخری حصّہ سے اصل مقصد نکھر کر سامنے آگیا۔ ان حضرات کی دراصل دشواری یہ ہے کہ یہ باقی پارٹیوں کی طرح ایک سیاسی پارٹی ہے لیکن چونکہ ان کا دعویٰ اقامتِ دین کا ہے اس لئے انہیں اپنے ہر پروگرام کو اسلام کا نقاب اوڑھانا پڑتا ہے۔ یہ بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر حربہ استعمال کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء کا ذکر ہے سکھر میں کارکنانِ جماعت اسلامی کے ایک اجتماع میں ایک صاحب نے مودودی (مرحوم) سے سوال کیا کہ

ہمارے ہاں ایسے قوانین پائے جاتے ہیں جو صریحاً خلاف شریعت ہیں۔ کیا ایسے قوانین کی اطاعت طاغوت کی اطاعت نہیں۔

سوال (DIRECT) تھا لیکن مودودی (مرحوم) نے حسب معمول گول مول جواب دیا۔ فرمایا۔

ایک شخص کے شعور کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک گندے پانی کے تالاب میں پاتا ہے۔ وہ اس تالاب سے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اسے لامحالہ اس گندے پانی میں ہاتھ پاؤں مارنا ہوں گے۔ اب اگر وہ یہ شرط لگادے کہ پانی پاکیزہ ہوگا تو ہاتھ پاؤں ماروں گا ورنہ نہیں، تو وہ گندگی سے کبھی نہیں نکل سکے گا۔

اسی طرح اگر ایک شخص یہ شرط لگادے کہ اس نظام کو تبدیل کرنے کے لئے وہ صرف خالص اسلامی قوانین ہی سے کام لے گا تو وہ تبدیلی کا یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔

(ایشیا - ۲۸ر اپریل ۱۹۶۸ء)

اگر یہ حضرات اپنے غیر اسلامی اقدامات کے متعلق یہ کہنے کی جرأت اپنے اندر پاتے کہ وہ غیر اسلامی ہیں تو نہ ملک اس قدر خلفشار کا شکار ہوتا جو اسلام کے نام پر برپا کیا جاتا ہے اور نہ ہی اسلام دنیا میں اس قدر بدنام ہوتا۔ مولانا گوہر الرحمان نے جو کچھ کہا ہے اگر وہ سیدھی طرح کہتے کہ سیکولر نظام کا یہی تقاضا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔

ایک قدیم رفیق کی جدائی

بزم طلوع اسلام، راولپنڈی نے اطلاع دی ہے کہ بزم کے قدیم رفیق اور قرآنِ کریم کے مخلص اور سرگرم مبلّغ، شیخ محمد فیروز (ریٹائرڈ فارسٹ آفیسر) کا انتقال ہوگیا ہے۔

اس سے وہ بزم ایک مخلص کارکن، اور تحریک ایک قدیم ہمسفر کی رفاقت سے محروم ہوگئی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور اراکین بزم، اور مرحوم کے پس ماندگان کو توفیقِ صبر۔

شریکِ غم - ادارۂ طلوع اسلام - لاہور

بتقریب جشنِ نزولِ قرآن (۱۹۸۳ء)

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

(پرویز صاحب کا یہ خطاب عید الفطر
کی تقریب کے لئے لکھا گیا تھا لیکن
رسالہ اس سے پہلے شائع ہو رہا ہے
اس کا مطالعہ کرتے وقت اسے
ملحوظ رکھیئے)

باسمہٖ تعالیٰ

بتقریبِ جشنِ نزولِ قرآن

ہو نہ جائے آشکار اثرِ پیغمبر کہیں

عزیزانِ گرامی قدر! اسلام و رحمت!

ہم جس مسرت آفرین اور نشاط آور تقریب کے منانے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ نزولِ قرآن کا جشن ہے جس کے منانے کا حکم خود خدا نے دیا تھا جب فرمایا تھا کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ (۱۰/۵۷)

اے نوعِ انسان! تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے یہ ضابطۂ ہدایت تمہارے پاس آگیا ہے۔ اس میں، ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ اور جو، ہر اس قوم کی، جو اسے اپنا ضابطۂ حیات تسلیم کر لیتی ہے، کامیابیوں کی راہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے، اور انہیں سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

اور اس کے بعد ہے: قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ (۱۰/۵۸) — "ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطۂ حیات کا مل جانا خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ تم اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ ہر اس شے سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے رہتے ہو۔ یعنی زندگی کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور عزیز تر ہے۔" جب مسلمان اسلام کے صدرِ اول میں آزاد تھے تو اس جشن کو قرآن کی شہادت کے مطابق اس کے شایانِ شان طریق سے منایا کرتے تھے — وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ ..... (۱۳/۳۶) — "یہ جماعتِ مومنین جنہیں ہم نے اس کتاب کا وارث بنایا ہے خدا کے اس عطیۂ عظمیٰ پر جشن مناتی ہے۔" اس کے بعد جب دین، مذہب میں بدل گیا اور اُمّت محکوم ہو گئی تو یہ جشن محض "سیلویوں کی عید" بن کر رہ گیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں — عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین

جس آیت (۱۰/۵۷) میں اس جشنِ مسرت کا ذکر ہے، اس میں خطاب النَّاس یعنی پوری نوعِ انسان سے ہے۔ یہ اس لئے کہ قرآن تمام انسانوں کے لئے قیامت تک ضابطۂ حیات ہے۔ اس کی تعلیم کسی خاص قوم، خاص نسل یا کسی خاص خطۂ زمین تک محدود نہیں۔ سُورج بلا امتیازِ رنگ و نسل تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں روشنی کا سرچشمہ ہے۔ جو بھی اپنی آنکھ کھلی رکھے گا، اس سے مستفید ہو جائے گا۔ اس نے قرآن کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ ٱلنَّاسَ مِنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ ..... (۱۴/۱) "اے رسولؐ! ہم نے یہ کتاب تیری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ تُو اس کے ذریعے لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے"۔ اس میں ایک لطیف نکتہ بھی پنہاں ہے۔

قرآن کریم ہر جگہ ظُلُمٰت (تاریکیوں) کو جمع کے صیغے میں لایا ہے، اور نُور (روشنی) کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ تاریکیاں مختلف قسم کی ہو سکتی ہیں ——— دین کی جگہ مذہب کی پھیلائی ہوئی تاریکیاں، توہم پرستی کی تاریکیاں، تعصب اور تنگ نظری کی تاریکیاں۔ استبداد و ملوکیت کی تاریکیاں۔ استحصالِ سرمایہ دار کی تاریکیاں۔ و دیگر متعدد اقسام کی تاریکیاں۔ لیکن ان کے ازالہ کے لئے قرآن کی ایک ہی روشنی کافی ہے۔ دیاسلائی کی ایک کرن سارے کمرے کی تاریکی کو دُور کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نُور سے تعبیر کیا ہے؛ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُم بُرْهَٰنٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا (۴/۱۷۵)۔ "اے نوعِ انسان! تمہارے رب کی طرف سے تمہاری جانب ایک کتاب آگئی ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ پیش کرتی ہے، اس سے وہ عقل و شعور کو چکا چوند کر دیتی ہے۔ وہ کتاب نہیں، روشنی کا مینار ہے" روشنی کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر شے کو اس کی اصلی اور حقیقی شکل میں دکھا دیتی ہے۔ تاریک کمرے میں آپ رسی کو سانپ اور سانپ کو رسی سمجھ کر فریب میں آ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں ماچس جلائیے تو سانپ، سانپ اور رسی، رسی نظر آ جاتی ہے۔ زندگی کی کامرانیوں کے لئے یہ قدمِ اوّل بڑا اہم ہوتا ہے۔ روشنی کی موجودگی میں انسان کی نگاہ دھوکا نہیں کھا سکتی۔

قرآن نور ہے

قرآن کو نُور (روشنی) قرار دینے میں دوسرا اہم نکتہ یہ پوشیدہ ہے کہ روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے خارجی سہارے یا ذریعے کی محتاج نہیں ہوتی۔ آپ روشن بلب کو موم بتی لے کر تلاش نہیں کرتے۔ وہ بلب اپنی موجودگی کی آپ شہادت اور اپنی روشنی کا ثبوت آپ ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن، جو ساری کائنات کو روشن کر سکتا ہے، اپنے حقائق کی وضاحت کے لئے خارجی سہاروں کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی تعلیم کو خود سمجھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی روشنی سے استفادہ کے لئے عقل کی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بس۔

جو لوگ اس روشنی سے مستفید ہوں، اُن پر ایک فریضہ بھی عائد ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ اس سے اپنا راستہ روشن کر کے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔ اُن کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اس چراغ کو لے کر دنیا میں چلیں پھریں اور اقوامِ عالم کی تاریک راہوں کو روشن کرتے جائیں۔ فرمایا:۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَءَامِنُوا۟ بِرَسُولِهِۦ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِن

رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۷/۲۸)

اے جماعتِ مومنین! تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور جو کچھ تم سے تمہارا رسولؐ وحی کی رُو سے کہتا ہے، اس پر یقین رکھو اور اس کی اطاعت کرو۔ اس طرح وہ تمہیں سامانِ رحمت و ربوبیت کے دو حصے دے گا (ایک حصہ اس دنیا میں، اور دوسرا آخرت میں) اور تمہیں (قرآنی بصیرت کی) ایسی شمع نورانی عطا کر دے گا جسے ہاتھ میں لے کر تم دنیا میں چلو گے تو انسانیت کی راہیں روشن ہوتی جائیں گی۔ اور اس طرح تم اور دیگر اقوام ہر قسم کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رہیں گی۔ یاد رکھو! اللہ کے نظام میں، تباہیوں سے حفاظت، اور زندگی کی نشوونما کا سامان، دونوں موجود ہیں۔" (۵۷/۲۸)

مومنین کا فریضہ

صدرِ اوّل میں وسائلِ رسل و رسائل کی کمی اور ذرائع مواصلات کی سُست رفتاری کا یہ عالم تھا کہ سواری کے لئے بیشتر اونٹ ہی میسّر تھا۔ لیکن اس کے باوجود، وہ حضرات، شمعِ قرآنی کو ہاتھ میں لے کر، اس طرح قریہ قریہ، بستی بستی، ملک ملک پھرے کہ چند سالوں کے عرصہ میں، مصر سے لے کر چین تک، اور ہندوستان سے لے کر افریقہ تک انسانیت کی راہیں روشن کر دیں۔ اقبالؒ خدا کو مخاطب کر کے ان قندیل برداران قرآنی کے متعلق کہتا ہے ؎

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے — مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے — اور معلوم ہے تجھ کو، کبھی ناکام پھرے؟

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

(بانگِ درا — شکوہ)

اس کے بعد ملوکیت آ گئی اور اس نے قرآن کی شمع گُل کر دی اور عقل کے چراغ بجھا دیئے۔ اُمت کے راستے تاریک ہو گئے اور انسانیت کی راہیں روشن کرنے والی قوم خود دشتِ ظلمات میں راہ گُم کردہ مسافروں کی طرح حیران و سرگرداں مارے مارے پھرنے لگی۔ قرآن کریم نے اُمت کی ان دونوں حالتوں کا تقابل بڑے بلیغ الفاظ میں کیا ہے فرمایا:-

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ..... (۶/۱۲۲)

تم ان دونوں حالتوں کا موازنہ اس طرح کرو کہ، ایک شخص مُردہ ہو، اُسے از سرِ نو زندگی عطا ہو جائے اُس کے بعد، اُسے ایسی نورانی قندیل دے دی جائے جس سے وہ خود بھی روشنی میں چلے اور دوسروں کو بھی صحیح راستے پر چلائے۔ اس کے برعکس، دوسرا شخص ہے جو گہری تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے، اور اُن سے نکلنا نہیں چاہتا۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کبھی نہیں!

زمانۂ قبل از اسلام میں یہ قوم مُردہ تھی۔ قرآن کے نفسِ مسیحائی نے اسے زندگی عطا کی۔ شمعِ نورانی کو ہاتھ میں

لے کر اس نے اقوام عالم کی راہیں روشن کر دیں۔ بعد میں وہ چراغ تہ داماں چلا گیا تو یہ تاریکیوں میں ڈوب گئی، اور قرآن دشمن قوموں نے ایسا انتظام کیا کہ ـــــ ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات۔ خلافِ قرآن عقائد،

یہ شمع تہ داماں چلی گئی

نظریات، مسالک و مشارب کو عین اسلام بنا کر اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست کر دیا۔ قوم اتنی جلدی قرآن کو نظر انداز کر لینے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کے لئے عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ قرآن کی مثل ایک اور وحی بھی تھی جو روایات میں منضبط ہے۔ اہل فقہ نے کہا کہ ان کے ائمہ کے مرتب کردہ احکامِ شریعت، قرآن کی مثل ہیں۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب الھدایہ کے مقدمہ میں تحریر ہے کہ الھدایہ کالقرآن ـــ یہ کتاب (ھدایہ) قرآن کی مثل ہے۔ چنانچہ اس طرح اسلام، قرآن کے مطابق نظامِ حیات کا نام نہ رہا۔ مثلہٗ معہٗ۔ قرآن کی مثل اور قرآن کے ساتھ، انسانوں کے وضع کردہ، عقائد و احکام کا نام ہو گیا جس خدا نے قرآن عطا فرمایا تھا، اور اسے مکمل اور غیر متبدل قرار دیا تھا (۶/۱۱۶) اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ تمہارے لئے ضابطۂ حیات کے طور پر قرآن کافی ہے ـــ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱) ـــ "کیا ان لوگوں کے لئے وہ کتاب کافی نہیں جسے ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے" اس کا نام توحید تھا۔ یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب کو واحد اور مکمل ضابطۂ حیات سمجھنا۔ لیکن ان کی یہ حالت ہو گئی کہ: وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (۱۷/۴۶) "جب قرآن میں خدائے واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ نفرت سے منہ پھیر کر چل دیتے ہیں"۔ دوسری جگہ ہے: وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹/۴۵) ـــ "جب ان کے سامنے خدائے واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ بات ان پر سخت ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن جب خدا کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں"۔ وہ قوم جسے قرآن کا وارث قرار دیا گیا تھا، رفتہ رفتہ اس کی یہ حالت ہو گئی۔

صدیوں تک امت کی یہی حالت رہی، اور ہر نیا دن اس شمع ہدایت پر، غیر قرآنی تصورات و نظریات کے دبیز پردے ڈالتا چلا گیا، تا آنکہ مبداءِ فیض کی کرم گستری سے ہمارے ہاں اقبالؒ پیدا ہو گیا جس نے ان تمام

اقبالؒ اور قرآن

پردوں کو ایک ایک کر کے الگ کر دیا۔ اقبالؒ کی ساری زندگی، شمع قرآنی کی درخشندگی و تابناکی کو وجۂ فروغ دیدہ بنانے، اور جن قوتوں (سلطانی و ملائی و پیری) نے اسے صدیوں تک تہ داماں چھپائے رکھا تھا، ان کے مذموم جرائم کو بے نقاب کرنے میں بسر ہو گئی۔ انہوں نے قوم کو دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا:ـــ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

علامہ اقبالؒ نے قرآن کے شرف و مجد اور عظمت و اہمیت کے متعلق اتنی کثرت سے لکھا ہے کہ ایک تقریب میں اس کا احاطہ ناممکن ہے۔ میں خود اس باب میں بڑی کثرت اور وسعت سے لکھتا چلا آ رہا ہوں علاوہ مختلف مقالات و خطابات، میری مستقل تصنیف "اقبالؒ اور قرآن" اس کی آئینہ دار ہے۔ خود میری

ساری زندگی قرآنی تعلیم و پیام کی تشریحات میں گزری ہے۔ میری تین چار درجن تصانیف اِسی موضوع پر مشتمل ہیں اس وقت میں، علامہ اقبالؒ کے چند اشعار جستہ جستہ مقامات سے پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ انہوں نے اپنی پہلی (شعری) تصنیف مثنوی اسرار و رموز میں لکھا ہے ؎

قرآن کیا ہے؟

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ؟ | زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست ؟
آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم | حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات | بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے | آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ او | در فتد با سنگ جام از زورِ او
نوعِ انساں را پیامِ آخریں | حاملِ اُو رحمۃ للعالمینؐ ! ؎

(صفحہ ۱۴۰)

قرآن کرتا کیا ہے؟ فرمایا ؎

خستہ باشی؟ استوارت می کند | پختہ مثلِ کہسارت می کند
گر زمینی! آسماں سازد ترا | آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

"آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا" میں قرآن کا مقصود و منتہیٰ سمٹ کر آگیا۔

وہ جاوید نامہ میں کہتے ہیں ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است | ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود | جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

(جاوید نامہ صفحہ ۹۰)

دوسری جگہ حقائق قرآن کی ابدیت کے متعلق کہتے ہیں ؎

چوں مسلماناں اگر داری جگر | در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست | عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است | گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست | ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

(جاوید نامہ صفحہ ۲۷۲-۲۷۳)

اُس نے اِس انقلابِ عظیم کے متعلق، جسے قرآن برپا کرتا ہے، دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

(ارمغانِ حجاز ص۲۲۵)

اس انقلاب انگیز پیغام نے مغرب کی استعمار پسند، سرمایہ دار قوتوں کے ایوانِ ملوکیت میں زلزلہ برپا کر دیا۔ ہم نے تو اقبالؒ کو ایک شاعر ہی سمجھا تھا لیکن ان اقوام کی دیدہ وری نے بھانپ لیا کہ اگر اس کا پیغام عام ہو گیا، اور مسلمانوں نے قرآن کو اپنا ضابطۂ حیات قرار دے لیا تو جو کچھ صدرِ اوّل کے مسلمانوں کے ہاتھوں ایران اور روما کا حال ہوا تھا، وہی کچھ مغرب کی سرمایہ پرست اقوام کا حشر ہو گا۔ اس خطرہ کی روک تھام کیلئے انہوں نے بہت سی مؤثر تدابیر پر غور و فکر کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کے لئے مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کا تعاون حاصل کرنا از بس ضروری ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگرچہ یہ حضرات نظامِ سرمایہ داری کو عین مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں ـــ یعنی اسلام کے مطابق جو اُن کے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ لیکن ان کے لئے کھلے بندوں نظامِ سرمایہ داری یا اقوامِ مغرب کی حمایت یا تائید مشکل ہو گی۔ یہ ایسا بالواسطہ کر سکیں گے۔ اس کے لئے اُنہوں نے ایک اور ترکیب سوچی۔ جب رُوس کی کمیونزم نے پہلے پہل سر ابھارا ہے تو ان مغربی قوتوں نے اعلان کیا تھا کہ

دنیا کے خدا پرستو! آؤ ـــ اور ہمارے ساتھ مل کر الحاد اور بے دینی کے خلاف متحدہ محاذ بناؤ۔

امریکن بلاک کی سازش

طلوعِ اسلام نے اُس زمانے میں واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ یہ دعوت مسلمانوں کو اپنا آلۂ کار بنانے کے لئے دی جا رہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اسلام کے نزدیک خدا پر ایمان کا دعویٰ اُس کا قابلِ قبول ہے جو اُس خدا پر ایمان لائے جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ اس معیار کی رُو سے، مغرب کی (بزعم خویش) خدا پرست قومیں بھی اسی طرح خدا کی منکر اور ملحد و بے دین ہیں جس طرح رُوس۔ اس لئے ایک ملحد و بے دین کے خلاف دوسرے ملحد و بے دین کے ساتھ تعاون کرنا اسلام کا تقاضا نہیں۔ یہ سرمایہ پرست قوموں کا دامِ فریب ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت تو اس قسم کی دعوت کے انتظار میں تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۵۵ء میں امریکہ اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں سلسلۂ جنبانی ہوئی تو سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے امریکن بلاک سے کہا:۔

اگر یہ بلاک فی الواقعہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا۔ یہ اسکے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں ..... مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آ رہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ

پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو۔

(کراچی اور لاہور کے پبلک جلسوں میں تقاریر بحوالہ اخبار نسیم بابت ۱۷ تا ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء)

ظاہر ہے کہ مسلم عوام کا تعاون، مذہبی پیشواؤں کی وساطت ہی سے حاصل ہو سکتا تھا۔

امریکن بلاک کی طرح سے اس پیش کش کا جواب کیا ملا، اس کا تو علم نہیں، لیکن قرائن اس کے شاہد ہیں کہ ان میں کچھ راہ و رسم پہلے سے چلی آ رہی تھی جس نے بعد میں ربط باہمی کی شکل اختیار کر لی۔ مثلاً لاہور کے اخبار امروز کی یکم دسمبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں یہ خبر درج تھی:-

امریکن سفارت خانہ کے پروفیسر ڈاکٹر ولیز نے گورنمنٹ کالج میانوالی کے طلباء کو لیکچر دیئے جن میں کمیونزم کی مخالفت تھی۔ اُن کے ساتھ جماعت اسلامی لاہور کے راہ نما بھی آئے تھے اور مقامی امیر مولانا گلزار احمد بھی تھے۔

ان کے اس ربط باہمی کے سلسلہ میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھئے کہ مودودی (مرحوم) ۱۹۵۰ء میں سرمایہ دارانہ برانڈ کے اسلام کا پہلا ایڈیشن "مسئلہ ملکیت زمین" کے نام سے شائع کر چکے تھے۔ اس کے ایک دو اقتباس پیش خدمت ہیں۔ انہوں نے کہا تھا:-

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ پھر آخر تنہا زرعی جائداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا یہ بیان ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔

(مسئلہ ملکیت زمین پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء صفحہ ۵۲-۵۳)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی:-

آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ

تم صرف اس تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو۔ جسے تم براہ راست خود کرو، اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملے میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو۔ اس طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے، اور یہ کہ اجرت یا شراکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں۔ وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔"

(ایضاً صـ ۷۲ - ۷۳)

معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس ہم آہنگی کا سلسلہ ریگِ رواں کی طرح جاری رہا تھا اور یہ حضرات روس کے الحاد اور بے دینی کی آڑ میں مغرب کے نظامِ سرمایہ داری کو عین مطابق اسلام ثابت کرنے میں برابر کوشاں رہے۔ واضح رہے کہ میں خود کمیونزم کے خلاف ہوں۔ کیونکہ جن بنیادوں پر اس نظام کی عمارت استوار ہوئی ہے وہ قرآن کے سرتاپا خلاف ہیں۔ لیکن میں قرآن کی رو سے نظامِ سرمایہ داری کے بھی اسی طرح خلاف ہوں۔ اس موضوع پر میری کتاب "نظامِ ربوبیت"...... واضح شہادت ہے۔ اس کے برعکس یہ حضرات روس کی اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ مغرب کے نظامِ سرمایہ داری کو تقویت حاصل ہو۔ ابلیس کی مخالفت تاکہ شیطان کو تقویت ملے!

یہ سلسلہ اس انداز سے جاری تھا۔ تا آنکہ چند سال ادھر امریکن بلاک نے ایک قدم اور آگے بڑھانا ضروری سمجھا۔ جب ۱۹۷۶ء میں پاکستان سیرت کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں اڈنبرا یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے پروفیسر ڈبلیو منٹگمری واٹ بھی شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے ۶۔ مارچ ۱۹۷۶ء کو اپنے خطاب کے دوران کہا تھا کہ:

> اس وقت نوعِ انسانی اخلاقی اور ثقافتی سطح پر نہایت نازک صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے فرزندانِ توحید کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تبلیغ میسر آسکے تاکہ عیسائی اور مسلمان اپنے "مشترکہ دشمن" الحاد کے خلاف مل کر جہاد کر سکیں۔

(نوائے وقت لاہور مورخہ ۷ مارچ ۱۹۷۶ء)

فنڈامینٹل ازم

اس "زیادہ سے زیادہ تبلیغ" کے سلسلے میں انھوں نے ایک نیا قدم اٹھایا۔ واضح رہے کہ مقصد ان کا یہ تھا کہ مسلمانوں کے سامنے قرآن بے نقاب نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے انھوں نے سوچا کہ ان کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ حقیقی اسلام وہی ہے جو مسلمانوں کے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا، اور جس کی بنیاد روایات اور فقہ پر ہے۔ اس اسلام پر انہوں نے فنڈامینٹل ازم (FUNDA MENTAL ISM) کا لیبل لگا کر اسے

ہمارے مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تھما دیا کہ اسے ساری دنیا میں عام کرتے جائیں۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے یہ حضرات کس طرح شعلہ جوالہ کی طرح ساری دنیا میں بھاگے پھر رہے ہیں۔ آج کراچی میں ہیں، کل لندن میں۔ اگلے دن پیرس میں۔ پھر نیویارک میں، کبھی سویڈن اور ناروے میں، کبھی کینیڈا میں۔ سفر کے لیے ہوائی جہاز، حضر کے لیے فائیو سٹار (FIVE STAR) ہوٹل۔ شاہانہ استقبالیے خسروانہ طعام اور عشائیے۔ وعظ کے لیے ایسے ایسے گرانقدر ہال جن کا ایک ایک دن کا کرایہ ہزاروں روپے تک اُٹھ جائے۔ ان ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں اسلامک سنٹر، اسلامک کانفرنس، اسلامک سیمینار (اور نہ معلوم کون کون سے اسلامک) نام سے ان کے مراکز قائم ہیں جہاں سے التزاماً ان کا لٹریچر شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کے اخراجات کا اندازہ لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ انھوں نے کبھی بتایا ہے کہ یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے شہر شہر اور ملک ملک صدرِ اول کے مسلمان بھی پھرے تھے لیکن وہ شمعِ قرآنی کو ہاتھ میں لے کر پھرے تھے کہ انسانیت کی راہیں روشن ہو جائیں۔ اور یہ حضرات جہالت اور ابلہ فریبی کے ایسے ایسے دبیز پردے لے کر پھر رہے ہیں کہ قندیلِ قرآنی کی کرن تک بھی نمودار نہ ہونے پائے۔ ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ اسلام ہر ملنے کی ملوکیت کو راس آتا ہے۔ اقوامِ مغرب اس اسلام کو "فنڈامینٹل ازم" کے نام سے ہمارے مقدسین کے ہاتھوں عام کرا رہی ہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے کس حسرت و یاس سے اس حقیقت کو بے نقاب کیا تھا۔ جب کہا تھا کہ:

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد — کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا — پرستند مومن و کافر تراشد

"آسمان کی آنکھ نے اس قسم کا تماشا بھی کم دیکھا ہوگا جس سے جبریلِ امیں کا قلبِ مطہر چھید رہا ہے۔ انھوں نے ایک ایسی پرستش گاہ تعمیر کی ہے جس کا بُت کافر تراشتا ہے اور اسے مسلمان پوجتا ہے"

اقوامِ مغرب کو احیائے قرآن کے نعرہ سے جو خطرہ لاحق ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بے پناہ دولت کے زور سے اسے بکسر غیر مؤثر بنا کر اس اُمت کو ہزار برس پیچھے دھکیل دیا ہے اور خود مطمئن ہو کر بیٹھ گئی ہیں کہ جو کام توپ و تفنگ سے نہیں ہو سکتا تھا وہ ڈالر اور سٹرلنگ کے زور سے با آسانی ہو رہا ہے۔

بُت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے — ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دیر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے — اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

فنڈامینٹل ازم کی تحریک دنیا کے قریب قریب ہر مسلمان ملک میں کارفرما ہے۔ (بانگ درا — شکوہ)

جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی کئی بار عرض کر چکا ہوں۔ علامہ اقبال کی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"[1] اس میں انھوں نے نہایت برجستہ اور

[1] اگر کبھی ملت کے مقدر نے یاوری کی اور اس نے ملوکیت کے چنگل سے آزاد ہو کر قرآن کی طرف رُخ کیا تو میرے خیال میں اس نظم کو ہماری درسگاہوں کی اعلیٰ کلاسوں میں نصاب رکھا جائے گا۔

مؤثر انداز میں اقوامِ مغرب کی اس سازش کو بے نقاب کیا ہے جس کی رُو سے ان کی انتہائی کوشش ہے کہ اس بدنصیب امت کے سامنے قرآن کی تعلیم نہ آنے پائے۔ اس میں ابلیس کا ایک مشیر اپنے نظام (یعنی مغرب کے نظام) کے متعلق کہتا ہے:

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں غلام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

اس پر ابلیس نے کہا کہ:

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر[1] کہیں

یہی وہ خطرہ تھا جس کی روک تھام کے لیے اقوامِ مغرب نے ہمارے ملوکیتی اسلام کو جاذبِ نگاہ دھوں میں بند کر کے۔ جگہ جگہ اس کی ایجنسیاں قائم کر دی ہیں اور ہمارے مذہبی پیشواؤں کو اس کا کمیشن ایجنٹ مقرر کر دیا ہے۔

صدرِ اوّل کے مخالفینِ قرآن اپنے متبعین سے کہتے تھے کہ قرآن کے پیغام کو غیر مؤثر بنانے کے لیے ٹیکنیک یہ اختیار کرو کہ جہاں اس کی آواز اٹھے، شور مچا دو تاکہ کسی کے کان میں یہ آواز پڑنے نہ پائے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ "یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم ان لوگوں پر غالب آ سکتے ہو۔" بعینہٖ یہی ٹیکنیک عصرِ حاضر کے مخالفینِ قرآن اختیار کر رہے ہیں۔ اگر کہیں سے قرآن کی آواز بلند ہوتی ہے تو یہ شور مچا دیتے ہیں۔ "منکرِ حدیث ہیں"، "منکرِ سنتِ رسول اللہ ہیں"۔ ایک نیا اسلام ایجاد کر رہے ہیں ان کی بات مت سنو۔ یہ تمہیں اسلام سے منحرف کر دیں گے۔ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ ۲۲/۷۲۔ ان کا بس چلے تو یہ قرآن کی آواز بلند کرنے والوں کا گلا گھونٹ دیں۔

قرآنِ مہجور

ان لوگوں میں اتنی جرأت نہیں کہ یہ اعلانیہ قرآن سے منحرف ہو جائیں۔ اس کے لیے ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ قرآن کو صرف اس حد تک ساتھ رکھا جائے، جس حد تک اس سے ان کے مفاد کا تقاضا ہو۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے بلیغ اور شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے:۔ سورۂ فرقان میں ہے:۔

---

[1] ابلیس نے آگے جا کر وضاحت کر دی ہے کہ "شرعِ پیغمبر" سے مراد قرآن حکیم ہے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)

رسول اللہ بحضور رب العزت فریاد کریں گے کہ "یہ ہے میری وہ قوم جس نے تیرے قرآن کو مہجور بنا دیا تھا"

اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اس قوم نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تھا، لیکن لفظ "مَهْجُوْرًا" کے معنی اس سے کہیں گہرے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو گائے یا بھینس بھاگ جاتی ہے اس کے پاؤں کے ساتھ ایک رسی باندھ کر اسکا دوسرا سرا اس کے سینگ سے باندھ دیتے ہیں۔ لیکن رسی اتنی چھوٹی رکھتے ہیں کہ جانور کا سر بہت جھکا رہتا ہے اور اس طرح وہ یوں ..... جکڑا جاتا تھا کہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ عرب اپنے مویشیوں کو اس طرح باندھ دیتے تھے۔ اس طرح سے جکڑے ہوئے جانور کو مہجور کہا جاتا تھا۔ الہجار اس رسی کو کہتے تھے جس سے ان جانوروں کو جکڑا جاتا تھا۔ آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا ہے کہ حضور اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے کہ مسلمانوں نے قرآن کو اپنے خود ساختہ اعتقادات، خیالات، رسومات، روایات، تفاسیر، فقہی احکامات کی رسیوں سے جکڑ کر اسقدر مہجور بنا رکھا ہے کہ وہ ایک قدم بھی آزادی سے اٹھا نہیں سکتا۔ انھوں نے قرآن کو چھوڑا نہیں، اپنے سینوں سے لگا رکھا ہے۔ لیکن اس کی ساری آزادیاں سلب کر رکھی ہیں اور اسے اتنا ہی چلنے کی آزادی دی جاتی ہے جتنی ان کے خود ساختہ مذہب کی رسی مناسب سمجھتی ہے۔ یعنی یہ قرآن کے تابع نہیں ہیں، قرآن ان کے تابع ہے۔ یہ ہے مطلب قرآن کو مہجور بنا دینے کا۔ یہ جو بڑے دھڑلے سے کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں کوئی قانون اسلام و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس میں کتاب (یعنی قرآن) مہجور ہوتا ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ سنت (یعنی حدیث) قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ یعنی اگر کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو تو حکم حدیث کے مطابق نافذ ہوگا۔ قرآن کو منسوخ سمجھا جائے گا ..... اور حدیثوں کی تعداد دس لاکھ تک بنائی جاتی ہے اسی طرح فقہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں قرآن مجید اور فقہ کے حکم میں تضاد ہو تو قرآنی آیت کی اسی طرح تاویل کرنی چاہیے کہ وہ فقہ کے مطابق ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو قرآن کے حکم کو منسوخ سمجھا جائے۔ یہ ہے قرآنِ مہجور کی حالت ؎

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

یہ اس قرآن کی حالت ہے جس کے متعلق اس کے نازل کرنے والے نے کہا تھا کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵) "خدا کے قوانین کو کوئی بدل نہیں سکتا" حتیٰ کہ رسول اللہ بھی نہیں۔ آپ کی زبانِ مبارک سے خود خدا نے کہلوا دیا کہ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ (۱۰/۱۵) اسے میں بھی بدل نہیں سکتا۔

قرآن غیر مبدل ہی نہیں مکمل بھی ہے۔ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (۶/۱۱۶)

"تیرے رب کے احکام صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے ہیں" دین کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں جو اس میں نہ آ گئی ہو۔ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (۶/۳۸) یہی نہیں کہ یہ مکمل ہے، نہایت واضح بھی ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) اور ہم نے اے رسولؐ! تیری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جو ہر بات کو کھول کر بیان کر دیتی ہے۔ لیکن اسے سمجھنے کے لیے دو بنیادی شرطیں ہیں:-

قرآن سمجھنے کی شرائط

شرطِ اوّل یہ ہے کہ قرآن کی طرف آنے سے پہلے اپنے دماغ کو تمام غیر قرآنی خیالات، نظریات، اعتقادات سے پاک اور صاف کیا جائے۔ جو شخص اس طرح خالی الذہن ہو کر قرآن کی طرف نہیں آئے گا قرآن اس کی سمجھ میں نہیں آ سکے گا۔ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (۵۶/۷۹) اس سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے پاکیزگیٔ قلب و دماغ ضروری ہے اور اسی کا نام توحید ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

جو غیر قرآنی خیالات کو دماغ کے بتکدے میں رکھتا ہے وہ حریمِ کعبہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔

نہ مدہ اقبال را در کعبہ اے شیخ حرم
ہر زماں در آستیں دارد خداوندِ دگر

صحیح راستہ وہی ہے جس کی طرف قرآن راہنمائی کرتا ہے: قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ (۲/۱۲۰؛ ۳/۷۳؛ ۶/۷۱) راستے دو ہی ہیں۔ قرآنی اور غیر قرآنی، اور دونوں ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ج (۲/۲۵۶) جو راستہ جس کا جی چاہے اختیار کر لے لیکن کفر کا راستہ ہو یا اسلام کا، اسے خالصتہً اختیار کرنا ہو گا۔ کفر اور اسلام کی آمیزش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ شرک ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶)

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

کفرِ خالص بھی اپنے نتائج رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ اس دنیا تک محدود ہوتے ہیں۔ جس طرح اقوامِ مغرب کی حالت ہے کہ وہ سیکولر نظام اپنائے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے فطرت کی قوتیں ان کے سامنے سربسجود ہیں۔ اس کے برعکس اسلامِ خالص کے نتائج اس دنیا اور اُس دنیا دونوں پر محیط ہوتے ہیں۔ لیکن جو قوم کفر اور اسلام کی آمیزش کرے یعنی جو بات قرآن کی مفید مطلب ہو، اسے اختیار کر لے۔ جو اس کے خلاف جائے اس کی جگہ غیر قرآنی مسلک اختیار کر لے۔ اس کی کیا حالت ہوتی ہے اسے قرآن کی زبانی سنیے۔ فرمایا:

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ج "کیا تمہاری روش یہ ہے کہ کچھ باتیں قرآن کی لے لیتے ہو اور کچھ غیر قرآنی۔" یاد رکھو! فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ

إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)
جو قوم ایسی روش اختیار کرے گی اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگا اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ رسوا کن عذاب میں مبتلا۔" یا دلی تدبر یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ یہ ہماری ہی داستان ہے۔ ہم ہی نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہے۔ آخرت کا عذاب تو آخرت میں جا کر دیکھا جا سکے گا ہم اس دنیا میں جس ذلت و خواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے لیے کسی شہادت اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔ ہم ہر روز پنجوقتہ نماز کی ہر رکعت میں خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں کا راستہ دکھا، اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ جو تیرے انعامات کے مستحق قرار پائے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ وہ ایسے نہیں تھے جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ راہ گم کردہ تھے۔" ہمارے ہاں متفقہ طور پر کہا جاتا ہے کہ مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہودی ہیں۔ دنیا کے قریب ایک ارب مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ وہ یا تو اس " مغضوب علیہ" قوم کے ہاتھوں آئے دن ذلیل و خوار ہوتے رہتے ہیں اور اس سے ترساں و لرزاں کہ نہ معلوم ان کی باری کب آجائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا کی اس سے زیادہ عبرت انگیز مثال کہیں اور مل نہیں سکتی۔ یہ نتیجہ ہے اس مذہب کا جو قرآنی اور غیر قرآنی عناصر کا ملغوبہ ہے اور جسے ہم احیائے اسلام کا نام دے کر (دنیا کو تو کیا) اپنے آپ کو فریب میں رکھتے ہیں۔ اقوام مغرب بھی یہی چاہتی تھیں کہ ہم اس مذہب کو اسلام سمجھ کر اس کے ساتھ چمٹے رہیں اور اس کا خمیازہ بھگتیں۔ انھوں نے حق و باطل کے اس ملغوبہ کو بنیادی اسلام (فنڈامینٹلزم) کا لبادہ اوڑھا کر ساری دنیا میں پھیلا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کچھ عیسائی مشنریوں کے ہاتھوں تو ہو نہیں سکتا تھا۔ یہ مسلمانوں کے مذہبی راہ نماؤں کے ذریعے ہی ممکن تھا اور یہ کھیپ انہیں بڑے سستے داموں مل گئی۔

عقل و فکر

قرآن حکیم کے سمجھنے کی دوسری شرط یہ ہے کہ اسے عقل و فکر اور غور و تدبر کی رو سے سمجھا جائے۔ اس نے قرآن کی صداقت کو تسلیم نہ کرنے والوں کے خلاف جرم ہی یہ عاید کیا ہے کہ وہ غور و تدبر سے کام نہیں لیتے۔ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ (۴/۸۲) دوسری جگہ ہے أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۴۷/۲۴) یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر سے کام نہیں لیتے۔ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟" انتہا یہ کہ وہ اس ایمان کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا جو عقل و فکر کی رو سے نہ لایا گیا ہو۔ وہ مومنین کی (DEFINITION) ہی یہ کرتا ہے کہ: وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) "یہ وہ لوگ ہیں کہ اور تو اور اگر خدا کی آیات (احکام الٰہیہ) بھی ان کے سامنے پیش کی جائیں تو یہ انہیں بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں مان لیتے۔"

قرآن کریم نے غور و فکر کی اہمیت کو ایسے مؤثر انداز میں سمجھایا ہے کہ بات سیدھی دل تک اتر جاتی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ برسوں تک مسلسل تبلیغ کرتے رہے اور مخالفین نے اس پر بہت

گم کان دھرا۔ ایک دفعہ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنا چاہتا۔ صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں — ایک بات! " قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ " (۳۴/۴۶)
لیکن یہ بات ایسی اہم ہے کہ اسے یونہی چلتے پھرتے نہیں سنا جاسکتا۔ تم میں سے ایک ایک، دو دو آدمی بھی جو سننا چاہیں، رُک جائیں۔ ٹھہر جائیں (اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى)

سوچا کرو

تو میں وہ بات سنا دوں گا۔ جب وہ رُک گئے تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ وہ ایک بات جس کے لیے میں نے تمہیں روکا ہے۔ یہ ہے کہ (ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا) "تم سوچا کرو" بس یہی ایک بات ہے جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ سوچا کرو۔ غور و فکر کیا کرو۔ اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا تو تم خود اس نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے کہ " مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (۴۶/۳۴) " تمہارا جو رفیق تم سے یہ بیان کر رہا ہے، وہ پاگل نہیں ہے " — یہ ہے غور و فکر کی اہمیت جس کی تاکید سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔

مذہب اپنی کامیابی کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ وہ غور و فکر کی شمعیں بجھا دے۔ دلیل و برہان کے چراغ گل کر دے۔ سوچنا حرام قرار دے دے۔ چنانچہ جو مذہب ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا، اور جسے اب دوبارہ زندہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا مسلک یہی ہے کہ شریعت کے معاملات میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کوئی معاملہ سامنے آئے، آپ اس پر (ON MERIT) گفتگو نہیں کر سکتے۔ ایک شخص اپنی آنکھ کا عطیہ دیتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اسے کسی نابینا کی آنکھ میں پیوست کر دیا جائے تاکہ اسے بینائی حاصل ہو جائے۔ سوچیے کہ اس سے بڑھ کر نیک کام کونسا ہو سکتا ہے؟ لیکن حضرات علماء کرام کی طرف سے فتوے صادر ہو جاتا ہے کہ ایسا کرنا ناجائز ہے۔ پوچھا جائے کہ ایسا کرنا کیوں ناجائز ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ احکامِ شریعت میں "کیوں" نہیں پوچھا جاتا۔ جو ایسا سوال کرتا ہے اس کے ایمان میں فرق ہوتا ہے۔ اگر زیادہ اصرار کیا جائے تو آپ کے خلاف ارتداد کا فتوے عاید کر دیا جائے گا اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ شریعت کی رو سے مرتد کی سزا قتل ہوتی ہے۔ پراپیگنڈا کی جو مشینری ان

آپ سوچ ہی نہیں سکتے

کے پاس ہے کسی بڑی سے بڑی مملکت کا پبلسٹی نظام بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہر ملک میں، ہر شہر میں، ہر گاؤں، ہر قریہ میں۔ ہر گلی ہر محلہ میں (بلکہ اب تو ہر سڑک پر اور ہر راستہ میں) مسجد موجود ہوتی ہے۔ اگلے ہی جمعہ کو ملک کی ہر مسجد سے آپ کے خلاف الحاد و بے دینی کے فتوے جاری ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ کی کیا مجال ہے کہ آپ گھر سے باہر قدم بھی رکھ سکیں۔ اگر آپ ان کے شرعی فتوے کی سند پوچھیں تو خدا کے کسی حکم کا (جو قرآن میں ہو) حوالہ نہیں دیا جاتا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسلاف سے ایسا ہی منقول ہے۔ یا یہ سلفِ صالحین کے مسلک کے مطابق ہے۔ ان کے ہاں اسلاف کے اتباع کی شدت کا کیا عالم ہے، اس کا اندازہ اس تاریخی واقعہ سے لگائیے:۔
دمشق کی جامع مسجد (جو بنی امیہ کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی) اپنے عہد کی سب سے بڑی مسجد تھی۔

کچھ عرصہ بعد انجینئروں کی ایک جماعت نے حسابی قاعدے سے جائزہ لیا تو دیکھا کہ اس کا رُخ کعبے سے کچھ ہٹا ہوا ہے۔ علماء کرام نے اس مسئلہ پر بحث کے بعد کہا کہ اگر انجینئروں کی بات

اسلاف پرستی:

کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ اس سے پہلے ہمارے اسلاف نے جو نمازیں پڑھی ہیں، وہ سب باطل تھیں لہٰذا ہم چند انجینئروں کی بات پر اسلاف کے متعلق ایسا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ مسجد کا رُخ ویسے ہی رہنے دیا گیا۔ اور اس کے بعد جتنی مسجدیں بھی اس مسجد کے رُخ کے مطابق تعمیر ہوئیں ان کا رُخ بھی کعبے سے ہٹا ہوا رہا۔ ہماری مذہبی پیشوائیت میں اسلاف پرستی کا یہ عالم ہے کہ یہ تو ان مسائل کے متعلق ہے جو ماضی میں پیش آ چکے ہیں۔ اور جو نیا مسئلہ سامنے آتا ہے اس کے متعلق ان کے فتوے صادر فرمانے کا انداز بھی بڑا دلچسپ ہے۔ جب (غیر منقسم) ہندوستان میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال شروع ہوا تو اس کے متعلق جائز یا ناجائز ہونے کا فتویٰ مانگا گیا۔ اس زمانے کے مجلس

لاؤڈ سپیکر ناجائز:

جمعیت العلما کے صدر مفتی کفایت اللہ (مرحوم) نے اس کے جواز میں فتویٰ دیا۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کے (اس زمانہ کے) مفتی اعظم مولانا محمد شفیع (مرحوم) نے فرمایا کہ وہ ایسے اہم مسئلہ کے متعلق تحقیق کیے بغیر فتویٰ نہیں دے سکتا۔ اس تحقیق کے لیے انھوں نے الیگزینڈرا ہائی سکول بھوپال کے سائنس ماسٹر پروفیسر نندن لال صاحب سے دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ "برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامّل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے"[1] چنانچہ اس تحقیق انیق کے بعد مفتی صاحب نے عبادات کے لیے" لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو حرام قرار دے دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے بعد اوروں تو اور، خود مفتی صاحب (مرحوم) بھی لاؤڈ سپیکر کا استعمال بلا تامّل کرتے رہے۔

تاریکیوں کے یہ پردے ہمارے ہاں تک ہی محدود نہیں۔ تمام مسلم ممالک میں یہی مسلک رائج ہے اس لیے ہر جگہ ظلمت کی یہی کیفیت ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ جوں جوں اوپر اٹھتے ہیں تاریکیوں کے یہ پردے دبیز تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حرمین الشریفین، اسلام کے متعلق مرکزی مقام سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ ادھر کی بات ہے۔ مدینہ یونیورسٹی کے صدر شیخ عبدالعزیز بن باز نے یہ اعلان کیا تھا کہ

زمین ساکن ہے:

زمین ایک جگہ پر قائم ہے اور سورج اس کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف تصور کرے تو اسے پھانسی پر لٹکا دینا چاہیے۔ انھوں نے کہا تھا کہ چاہے کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو گئی ہو، اب بھی اگر لوگوں کو صحیح راستے پر لایا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ بنی نوع انسان خدا کے

---

[1] میں اس واقعہ کو حوالے کے ساتھ پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔

ہیں کہ زمین اپنی جگہ ساکت ہے اور سورج اس کے گرد گردش کر رہا ہے۔ طلوع ہوتا ہے اور پھر غروب ہوتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج کے دعوے کے مطابق اگر زمین گردش کرتی ہوتی تو پھر شہر، درخت، پہاڑ، دریا اور سمندروں میں استقامت نہ ہوتی۔ اگر زمین گردش کرنے لگے تو مشرق کے شہر مغرب میں اور مغرب کے شہر مشرق میں دکھائی دینے لگیں۔

(بحوالہ طلوع اسلام اگست ۱۹۶۶ء صفحہ ۸)

یہ حضرات قوم کو اس مقام پر پہنچا دینا چاہتے ہیں جہاں چار سو سال پہلے مغرب کی عیسائی قومیں تھیں۔ جب پادریوں نے گیلیلی کے خلاف اسی جرم کی پاداش میں سزا کا حکم سنایا تھا۔ ان اقوام نے پادریوں کو گرجے کی چار دیواری میں محصور کر دیا تو آج وہ چاند (بلکہ اس سے بھی آگے تک) تک جا پہنچے ہیں۔ اگر مسلمان کے ہاتھ سے قرآن کا دامن نہ چھڑایا ہوتا تو آپ دیکھتے کہ یہ قوم اقوام مغرب کی امام ہوتی۔ اور سائنٹفک ارتقاء میں سب سے آگے۔ سوچیے کہ جو قرآن اس ایمان کو بھی ایمان تسلیم نہیں کرتا جو علم و عقل کی تائید کے بغیر لایا گیا ہو۔ وہ اس قوم کا شمار کس زمرے میں کرے گا جو آج بھی یہ کہے کہ جو شخص یہ تصور کرے کہ زمین گردش کرتی ہے۔ اسے پھانسی کے تختے پر لٹکا دینا چاہیے۔

کفر و اسلام میں حد امتیاز

یہ تو رہا وہ علمی اور عقلی میدان جس میں امت کو ہزار سال سے محصور رکھا گیا ہے اور جسے اب (اقوام مغرب کے منشا کے مطابق) اصلی اور بنیادی اسلام کہہ کر عام کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک عمرانی اور سیاسی گوشوں کا تعلق ہے۔ قرآن ہمیں جس زمرے میں شمار کرتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے سقراط کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ اس کا ارشاد ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

"اور جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ وہی تو کافر ہیں"

کتاب اللہ

اس وقت مسلمان ممالک میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہو۔ کوئی حکومت بھی ایسی نہیں جس میں اقتدار اعلیٰ قرآن کو حاصل ہو۔ اور جس میں فیصلے خالص قرآن کے مطابق ہوتے ہوں۔

یہ ہے قرآن کی روشنی جس میں ہر شے اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں سامنے آجاتی ہے جس میں اسلام اور کفر ایک دوسرے سے متمیز ہو جاتے ہیں۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہماری حکومت نے اس روشنی پر کیوں دبیز پردے ڈالے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت نے اسے کیوں تہ دامن رکھا۔ اور آج اقوام مغرب اسے کیوں اپنی پھونکوں سے (خدا نہ کردہ) بجھا دینا چاہتی ہے۔

اے مسلمانو! ایمان لاؤ

اس مقام پر یقیناً یہ خیال آپ کے دل میں ابھرے گا کہ ان حالات میں قرآن کا ہم سے مطالبہ کیا ہے؟ اور اس کی رہنمائی کیا؟ اس کا مطالبہ اور رہنمائی بالکل واضح اور دو ٹوک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہم میں اتنی جرأت

ہے کہ اس کا سامنا کرسکیں؟ اور کیا اتنی ہمت ہے کہ اس کا اعتراف اور اعلان کرسکیں؟ اگر آپ میں اس کی ہمت ہے تو دل کڑا کرکے سنیئے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ سورۃ النساء میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ (۴/۱۳۶)

اس کے معانی اور مفہوم پر غور سے سنیئے۔ خطاب کے الفاظ ہیں۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا۔ یعنی اے ایمان والو! اور انہیں حکم یہ دیا گیا ہے: آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ۔ "تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جسے اس نے اپنے رسول پر نازل کیا تھا"۔ اس سے معاً دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو "اے ایمان والو!" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ان سے یہ کہنا کہ "تم ایمان لاؤ" کچھ عجیب سا نظر آتا ہے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس میں مخاطب ہم مسلمان ہیں جو بزعم خویش اپنے آپ کو صاحب ایمان سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت ہم صاحب ایمان نہیں ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ "اے مسلمانو! جو اپنے آپ کو صاحب ایمان سمجھتے ہو، قرآنی معیار کے مطابق تم صاحب ایمان نہیں ہو۔ تم صحیح معنوں میں صاحب ایمان نہیں ہو اور تمہارے لیے بھی اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے جس طرح ایک غیر مسلم کے لیے۔ دل و دماغ کے کامل اطمینان سے کتاب اللہ کی صداقت پر ایمان اور پھر یہ فیصلہ کہ ہماری زندگی کا ہر معاملہ کتاب اللہ کے مطابق طے ہوگا۔ اقبالؒ نے ان مسلمانوں کو جو مسلمان کہلاتے ہوئے بھی مسلمان نہیں "مسلمانِ نامسلمانے" کہہ کر پکارا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

چہ گویمت ز مسلمانِ نامسلمانے
جز ایں کہ پورِ خلیل است و آزری داند!
(پیام مشرق)

یہ مسلمان اپنے آپ کو اس لیے مسلمان کہتا ہے کہ یہ مسلمان کے گھر پیدا ہوگیا۔ اس کے بعد عملاً یہ نامسلمان ہے۔ اسے اپنے موجودہ تصورات و نظریاتِ حیات کو چھوڑ کر (یعنی جن کی سند اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ اسلاف سے متواتر چلے آرہے ہیں) قرآنی تصورات و نظریات کی صداقت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اور یہ ہوگا أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ کا قرآنی مفہوم۔ یعنی ہر غیر قرآنی قوت کی حکمرانی سے منہ موڑ کر کتاب اللہ کی حکمرانی کو تسلیم کرنا۔ اسی سے یہ "نامسلمان، مسلمان ہوگا"۔ (زبور عجم) میں ہے ؎

کافر! دلِ آوارہ دگر بارہ بہ او بند　　بر خویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند
دیدن دگر آموز، شنیدن دگر آموز

جب تک ہم افراد اس انداز سے ایمان نہیں لائیں گے مسلمان نام رکھنے والی قوم کے افراد تو ہوں گے۔ قرآنی معیار کے مطابق مسلمان کہلانے کے حقدار نہیں ہوں گے۔ اور جب تک کوئی مسلمان قوم یہ اعلان نہیں کرے گی کہ اس کے تمام فیصلے قرآن مجید کے مطابق ہوں گے۔ نہ اس کی مملکت اسلامی ہوگی اور نہ اس کے قوانین اسلامی۔ یہ حقیقت بڑی تلخ ہے۔ لیکن جب تک ان "تلخ حقائق" کا سامنا نہیں کیا جائے گا۔ ع "تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ"

ہمارا شمار زندہ قوموں کی صف میں نہ ہو سکے گا۔ اقبال بہت پہلے کہہ گیا ہے کہ

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز
دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را
قیامت ہائے پیشیں را برانگیز!

(ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۰۲)

آخر میں مجھے چند الفاظ میں یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن کا پیغام کیا ہے اور کس کے متعلق ہے۔

قرآن میں کس کا بیان ہے؟

ہمارے ذہن میں کچھ اس قسم کا تصور ہے کہ خدا ایک حاکم مطلق کی طرح آسمانوں پر بیٹھا اپنے احکام نافذ کرتا رہتا ہے اور ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم ان احکام کی اطاعت کرتے رہیں۔ اگر ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتا ہے۔ اگر ان احکام سے سرکشی برتتے ہیں تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔ اور غصے میں آکر ہمیں جہنم رسید کر دیتا ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن قرآن کے ارشادات کی رُو سے اس میں خود ہمارے ہی فائدے کی باتیں ہیں، خدا کے فائدے کی نہیں۔ دنیاوی حکمرانوں کی حکومت، رعایا کی اطاعت کے سہارے قائم ہوتی ہے لیکن خدا اس سے مستغنی ہے وہ تو اس وقت بھی بہ ہر شانِ کبریائی خدا تھا جب ہم ہنوز وجود میں بھی نہیں آئے تھے اور اس وقت بھی قادرِ مطلق رہے گا جب ہم میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اس کا تختِ حکومت ہماری فرمانبرداریوں کے سہارے قائم نہیں۔ ہم اگر اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں تو اس سے ہمارا ہی فائدہ ہوتا ہے۔ ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس سے ہمیں ہی نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے احکام کی مثال طبیب کے نسخے کی سی سمجھیے کہ اس کے مطابق عمل کرنے سے ہمیں شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید کو شِفَآءٌ لِّلنَّاس کہا گیا ہے۔ سورۃ الانبیاء میں ہے: لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۱/۱۰) "ہم نے تمہاری طرف جو کتاب نازل کی ہے اس میں خود تمہارا ہی ذکر ہے اگر تم عقل و فکر سے اس پر غور کرو گے تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی۔"

دوسری جگہ رسول اللہ کو مخاطب کر کے فرمایا: وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ (۴۳/۴۴) "اس میں تیرا اور تیری قوم کا ذکر ہے"۔۔۔۔ سو قرآن میں مختلف جہتوں سے خود انسان کا ذکر ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو شعر کی زبان دی، بڑی خوبصورتی سے ادا کر دیا ہے وہ خدا کو مخاطب کر کے عرض کرتے ہیں ؎

محمدؐ بھی تیرا جبریلؑ بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

قرآن خدا کا ترجمان نہیں، انسان کا ترجمان ہے۔ وہ خدا کا کلام ہے لیکن اس میں ذکر ہمارا ہی ہے لیکن عربی زبان میں ذکر کے معنی د عام الفاظ میں، ذکر ہی نہیں۔ اس کے معنی شرف اور مجد کے بھی ہیں۔ ان معانی کی روشنی میں مذکورہ بالا آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن میں انسان کو اس کے مقام شرف و عظمت سے متعارف کرایا گیا ہے اور اسے بتایا گیا ہے کہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اسے شرف و احترام کا بلند ترین مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اس نے قرآن سے اعراض برتنے والوں کے متعلق کہا کہ ان کم عقلوں

سے کہو: بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ (۲۳/۷۱) — ہم انہیں شرفِ انسانیت کے بلند مقام پر لے جانا چاہتے ہیں اور یہ خود اپنے مقامِ بلند سے اعراض برت رہے ہیں اور پستیوں کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں — سورہ اعراف میں ہے :— وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ ۔ "ہم تو چاہتے تھے کہ اسے آسمان کی بلندیوں تک لے جائیں لیکن یہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا" یہ کیسے؟ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ج (۷/۱۷۶) "اس نے زندگی کے بلند مقاصد کے بجائے اپنی پست خواہشات ہی کو اپنا خدا بنالیا"۔

اربابِ اقتدار و ارکانِ مذہب کی یہی پست خواہشات ہیں جو قرآن کے راستے میں حائل ہیں اور انہیں ان پستیوں سے نکلنے نہیں دیتیں۔ دوسری طرف اقوامِ مغرب ہیں جو اچھی طرح جانتی ہیں کہ اگر اس قوم کے سامنے قرآن آگیا تو یہ نہ صرف ان کی سطح پر آجائے گی بلکہ اس بلند سطح پر پہنچ جائے گی جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکے گی۔ اس لیے کہ ان کے خدا نے کہا ہے: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (۳/۱۳۹) "اگر تم مومن ہوگئے تو انسانیت کے اس بلند ترین مقام پر پہنچ جاؤ گے جہاں کوئی بھی تمہارا مدِ مقابل نہیں ہوگا۔" اقبال کے الفاظ میں :—

مومنے بالائے ہر بالا ترے   غیرتِ او برنتابد ہمسرے

یہی ڈر ہے جو اقوامِ مغرب کو کھائے جا رہا ہے کہ

ع ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

ان کا یہ خدشہ بڑی حد تک بجا بھی ہے کہ اقبالؒ نے آج سے ستر اسی سال پہلے (سنہ ۱۹۰۷ء میں) ان کے شہر میں بیٹھ کر اعلان کیا تھا کہ —

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا!

ہم نے تو اقبالؒ کو ایک شاعر ہی سمجھا لیکن وہ لوگ جانتے ہیں کہ اس کی نگاہ کس قدر دور رس تھی کہ وہ اسی صحرا سے نکلے۔ اس شیر کی قوت کا راز قرآن کی اطاعت میں مضمر تھا۔ اقبالؒ کا مطلب بھی یہ تھا کہ پھر کوئی قوم قرآن کی شمشیر ہاتھ میں لے کر اٹھے گی جس کے سامنے باطل کی کوئی قوت ٹھہر نہیں سکے گی۔ اس لیے ان کی کوشش یہ ہے کہ قرآن کی قوت بازو نہ بننے پائے۔ انہوں نے جو کہا ہے کہ

ع "ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں"

تو شرعِ پیغمبر سے ان کی مراد قرآن کریم ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہا تھا کہ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ (۲۸/۸۵) "خدا نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے" لہٰذا قرآن ہی شرعِ پیغمبر ہے، باقی جو کچھ ہے مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ اضافے ہیں :—

مکتب و ملا سخنہا ساختند — مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود از تاویل مرد — آتشِ او در ضمیرِ او فسرد
ہر یکے دانائے قرآن و خبر — در شریعت کم سواد و کم نظر
عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس — منبرِ شاں، منبرِ کاگ است و بس
زیں کلیماں نیست امیدِ کشود — آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سود

(جاوید نامہ ص ۲۴۲-۲۴۱)

ملا اور اس کا مکتب قرآن ... کے ساتھ سامری کی طرح داستاں سرائی کرتے رہے، اور سادہ دل مومن اس سازش کو سمجھ ہی نہ سکے۔ وہ سمجھتے رہے کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں، وہ قرآن ہی ہے۔

یہ ایک زندہ قوم تھی، ملا کی تاویلات نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ اس کے قلب کی آگ اس کے سینے میں ہی بجھ کر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

ان میں سے جسے دیکھو، اپنے آپ کو قرآن اور حدیث کا علامہ سمجھتا ہو گا۔ لیکن درحقیقت شریعت حقہ پر اس کی قطعاً نظر نہیں ہو گی۔

یہ "معقول" کی بات کرے یا "منقول" کی، یہ دونوں علم اس کی حرص و ہوس کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہوں گے۔ اس کا منبر، منبرِ رسولؐ نہیں۔ روٹی بیچنے والے (نان فروش) کا خوانچہ ہو گا، یعنی یہ سب کچھ پیٹ کی خاطر کرے گا۔

"ان حکیموں کی آستینوں میں یدِ بیضا نہیں۔ ان سے کشودِ کار کی کیا امید ہو سکتی ہے؟"

یہ ہے عزیزانِ من! جو قرآن کے ساتھ ہوا۔ انھوں نے جس طرح قرآن کا مصرف یہ دکھا کہ

. . . ع — از یٰسینِ او، آساں بمیری

اسی طرح قرآن سے متعلق تقریبات بھی محض رسمیں بن کر رہ گئیں۔ اس عظیم تقریب کو یہ حضرات بھی عوام کی طرح "عید" لفظ کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ ہم اس سعادت پر جتنا بھی فخر کریں، کم ہے، کہ اسے "جشنِ نزولِ قرآن" کے نام سے ہم نے ہی متعارف کرایا۔ یہ اصطلاح اب عام ہو رہی ہے۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک اس کی اہمیت اب بھی کچھ نہیں۔ اہمیت ان کے نزدیک فطرانے ہی کی ہے۔ جسے یہ اس تقریب میں اکٹھا کر لیتے ہیں۔ علامہ کس سوز و گداز سے امتِ مرحومہ سے کہتے ہیں کہ

اے گرفتارِ رسوم، ایمانِ تو — شیوہ ہائے کافری زندانِ تو

"تیرا ایمان رسوم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ کفر کے نظریات نے جو جیل خانہ تعمیر کیا تھا، تو اس میں قید ہے۔"

آپ سوچیے کہ ہم قرآن کریم کے ساتھ کرتے کیا ہیں؟ ملک میں ہزاروں لاکھوں مساجد اور مدارس میں قرآنِ ناظرہ پڑھایا جاتا ہے یعنی قرآن کے الفاظ پڑھائے جاتے ہیں جن میں سے ایک لفظ کے

معنی بھی سمجھے نہیں جاتے۔ پھر اسی تعداد میں اور مکتب ہیں جہاں قرآن کو حفظ کرایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ قرآن کا ایک لفظ ..... سمجھ میں نہ آئے۔ پھر فنِ قرأت کے لیے مکاتب ہیں جن میں سکھایا جاتا ہے کہ قرآن کے حروف کے مخرج کیا ہیں۔ ان مکاتب اور مساجد میں ہر روز کروڑوں مرتبہ قرآن کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں لیکن ان کے معانی کوئی نہیں سمجھتا۔ یہ تو رہا سال کے گیارہ مہینوں کا پروگرام۔ رمضان المبارک میں الفاظ دہرانے کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ قریب قریب ہر مسجد میں تراویح میں قرآن ختم کیا جاتا ہے اور آخری راتوں میں ایک ایک رات میں ختم قرآن ہوتا ہے (جسے شبینہ کہا جاتا ہے)۔ ابھی ابھی (یکم رمضان کو) ایک اخبار میں اعلان شائع ہوا ہے کہ فلاں جگہ نمازِ تراویح کا پروگرام حسب ذیل ہوگا:-

(۱) ڈیڑھ پارہ ..... روزانہ کے حساب سے پہلا ختم قرآن بیس دنوں میں۔

(۲) پھر پانچ پارے " " " دوسرا ختم قرآن چھ راتوں میں۔

(۳) اور آخری تین راتوں میں تیسرا ختم۔

ختم قرآن کے ان اجتماعات میں نہ امام (حافظ) یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ پڑھ رہا ہوں، اس کے معنی کیا ہیں ..... نہ مقتدی کسی لفظ کے معنی سمجھتے ہیں اور سب مطمئن ہوتے ہیں کہ خدا نے اپنی کتاب کے متعلق جو فریضہ ہم پہ عائد کیا تھا ہم اسے بڑی جانفشانی سے ادا کر رہے ہیں! اگر اس کا ہزارواں حصہ بھی قرآن فہمی کے لیے صرف کرتے تو قوم کی حالت کچھ سے کچھ ہو جاتی۔

اس طویل داستان کو میں پھر اقبالؒ کے اسی شعر پہ ختم کرنا چاہتا ہوں جس میں اس نے سب کچھ سمیٹ کر کہہ دیا ہے کہ، ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اگر تو مسلمان کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی اور طریق نہیں کہ تو اپنی زندگی کو "قرآن کے قالب میں ڈھال لے"۔

والسلام

ضرورت رشتہ

ایک (مطلقہ) عزیزہ کے لئے جس کی عمر قریب چوبیس سال ہے اور جو لندن کے ایک بنک میں ملازم ہے اور برٹش اور پاکستانی نیشنیلٹی رکھتی ہے، مناسب رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکا تعلیم یافتہ، برسرِ روزگار اور پاکستانی ہو۔ کوائف جن میں نیشنیلٹی بھی مذکور ہو، ذیل کے پتہ پر بھیجے جائیں۔

(م) معرفت ادارہ طلوع اسلام - ۲۵-بی گلبرگ ۲ - لاہور

ابلیس و آدم

(تازہ ایڈیشن شائع ہوگیا)

پرویز صاحب نے جب سلسلۂ معارف القرآن شروع کیا تو من و یزداں (اللہ) کے بعد دوسری جلد ابلیس و آدم کے عنوان سے شائع کی تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں۔ اس کے بعد یہ کتاب کمیاب تھی۔ اب اس کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے

کتاب کے مشمولات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

۱۔ انسان کی تخلیق۔ ۲۔ نظریۂ ارتقا

۳۔ قصۂ آدم۔ ۴۔ ابلیس۔

۵۔ شیطان۔ ۶۔ جنّات۔

۷۔ ملائکہ ۸۔ روح (نفس)

۹۔ وحی (کشف و الہام) ۱۰۔ نبوّت اور رسالت۔

۱۱۔ کیا تمام مذاہب سچے ہیں؟

کتاب دستیاب بہترین سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ بڑی تقطیع ضخامت پونے چار سو صفحات۔ جلد مضبوط خوبصورت مزیّن اور مطلّا قیمت فی جلد -/۵۷ روپے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

۱۔ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار۔ لاہور

۲۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔بی گلبرگ ۲۔ لاہور

محترم پرویز صاحب کا درس قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں -

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
لاہور	جمعہ ۸ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD. TEL: 553-1896
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 227/229 ALUMROCK ROAD 38 3BH, بذریعہ V.C.R
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے شام	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1 بذریعہ V.C.R
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311. DOWNS VIEW, TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی صدر	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	بذریعہ V.C.R - دارالمبین (بالائی منزل) بالمقابل شاپ نمبر ۲ - سرمد روڈ
پشاور	۱- ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲- ہر جمعہ ۹ بجے صبح	۱- رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب - رفیق این صدیقی (OPP: V.I.P. MAIN GATE) پشاور صدر خیبر بازار روڈ فون ۷۴۵۹ ۲- تزئین محل B-3 یونیورسٹی ٹاؤن
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف - محمود علی صاحب - اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۴۹۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینیرنگ ورکس - شہید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	۱- ہر جمعہ ۴ بجے سہ پہر ۲- ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	۱- رہائش گاہ صلاح الدین صاحب - واقع 234-K-L کیہال (ایبٹ آباد) ۲- رہائش گاہ غلام مصطفےٰ اعوان صاحب واقع K-355 - کینٹ گراؤنڈ نمبر ۲ ایبٹ آباد
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واڑ سیٹلائٹ مکان نمبر ۴ - نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ - غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب -
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر توغی روڈ - باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائش گاہ : چوہدری مقبول شوکت - گل روڈ - سول لائنز
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۱۲/ ای کچہری روڈ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون : ۳۱۰۷۱)
مجلس تحصیل کبیروالا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام مطب حکیم احمد دین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۶۴)

مرتبہ: محمد اسلام نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی

نگہ بازگشت

(رہگذرِ طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل)

وحی اور عقل دونوں کے پیشِ نظر انسانی مسائل کا حل ہوتا ہے، وحی کے سامنے چونکہ حقائق بے نقاب ہوتے ہیں اور اس کی بنیاد علمِ خداوندی پر ہوتی ہے اس لئے وہ ان مسائل کا یقینی حل پیش کرتی ہے جس میں ظن و قیاس کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عقل قیاس پر چلتی ہے اور اس کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ ایک حل پیش کرتی ہے پھر اس پر تجربہ کرتی ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے۔ ان ٹھوکروں سے اس کا خون بہتا ہے، ہڈیاں ٹوٹتی ہیں۔ اس کے بعد پتہ چلتا ہے کہ قدم غلط سمت کو اٹھا تھا۔ وہ اس ناکام تجربہ کو چھوڑ کر پھر دوسری طرف قدم اٹھاتی ہے۔ اس طرح ٹھوکریں مارتی اور ٹھوکریں کھاتی جب آخرالامر کسی یقینی نتیجہ پر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی منزل ہے جس کا تعین وحی نے پہلے ہی کر دیا تھا۔

وحی کو انسانی مسائل کے جو حل تجویز کرنے تھے انہیں آخری مرتبہ قرآن میں محفوظ کر دیا گیا اور اس طرح وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ اب جو لوگ مسائل کا حل وحی کی رُو سے تلاش کرنا چاہتے ہیں انہیں قرآن پر غور و فکر کرنا ہوگا۔ جو قوم ایسا کرے گی وہ ان تباہیوں اور بربادیوں سے بچ جائے گی جو عقل کے تجرباتی طریق کا لازمی نتیجہ ہے۔ طلوعِ اسلام اسی روش کا داعی ہے۔ وہ انسانی مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اسی کی طرف دعوت دیتا ہے۔

تحریکِ پاکستان کی تائید اور حمایت میں طلوعِ اسلام کی داستانِ جہاد سینکڑوں نہیں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ہزارہا صفحات ہماری زندگی کی مقدس ترین آرزوؤں کے ترجمان ہیں اور ان تحریروں کا ایک ایک نقطہ خونِ جگر سے لکھا گیا ہے۔ طلوعِ اسلام علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت پر یقین رکھتا ہے کہ جہاں تک احیائے دین کی آرزوؤں کا تعلق ہے، وہ ایک جیتے جاگتے اور محسوس و مشہود نظامِ زندگی کے پیکروں ہی میں تکمیل پا سکتی ہیں اور ایک نظامِ حیاتِ معاشرہ یا مملکت کے قیام کے لئے ایک خطۂ زمین کا وجود ناگزیر ہے۔

طلوعِ اسلام کے نزدیک صرف خطۂ زمین کے حصول ہی سے تحریکِ پاکستان کا مقصد پورا

نہیں ہو جاتا تھا۔ اس کے سامنے اگلی منزل اس سے بھی زیادہ اہم تھی۔ اس کے نزدیک اگر اس سرزمین پر نظامِ خداوندی کا آفتاب جلوہ بار نہیں ہوتا۔ اگر یہ مملکت اپنے وجود کا جواز دینے والے کے نور سے جگمگا نہیں اٹھتی اور انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے بجائے یہاں خدائی قوانین کا فرمائی کا سرچشمہ فراہم نہیں پاتے تو جس مقصد کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ تھی کہ معرضِ وجود پاکستان کے بعد جب نئی منزل طلوعِ اسلام کے سامنے آئی تو اس نے اس منزل پر ارباب اقتدار کے اٹھتے ہوئے ہر قدم کا بنظرِ غائر جائزہ لیا اور جہاں کہیں اسے یہ نظر آیا کہ تحریکِ پاکستان کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کے اوجھل ہونے کا خطرہ لاحق ہے اس نے پوری قوت سے اس کا محاسبہ کیا۔ یہ محاسبہ اور مواخذہ اس قسم کی تخریبی اور انتقامی ذہنیت سے قطعاً پاک و صاف رہا جس کا مظاہرہ تحریکِ پاکستان کے شکست خوردہ مخالفین کی طرف سے، مملکتِ پاکستان کے خلاف بظاہر تنقید لیکن درحقیقت بنظرِ تخریب ہوتا چلا آرہا ہے۔

مملکتِ پاکستان کی زندگی میں طلوعِ اسلام نے اسی نقطۂ نظر کے تحت اپنے کالموں میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس تحریک کے مخلص ترین رفیقِ سفر کے فریضۂ رفاقت کی ایک پکار ہے۔ آیئے اس سلسلۂ تحریر کا جستہ جستہ ملخص ارباب اقتدار کو دیئے گئے مشوروں اور حالات و واقعات کی رفتار میں گزرے ہوئے ایام کی کچھ یادیں از سرِ نو تازہ کریں۔

اخبارات ہوں یا رسائل، وہ بالعموم ہنگامی حالات سے بحث کرتے ہیں، اس لئے ان کے مشمولات کی زندگی بھی ہنگامی اور عارضی ہوتی ہے۔ مرورِ زمانہ سے ان کے نقوش مدھم پڑتے جاتے ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد وہ مٹ ہی جاتے ہیں۔ اسطرح وہ جرائد اور مجلات ماضی کی تاریخ بن جائیں تو بن جائیں قوم کے حال اور مستقبل سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔

طلوعِ اسلام بھی خارجی حوادث اور ہنگامی حالات سے بحث کرتا ہے لیکن وہ ان کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیتا ہے اور پیش آمدہ مسائل کا حل بھی اسی کی راہنمائی میں پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس کے مشمولات پر مرورِ زمانہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ ان کی حیثیت مستقل ہوتی ہے جو ہر زمانے میں صحیح مشورہ دے سکتے ہیں۔ اس کی یہ مستقل حیثیت ہے جس کی بنا پر صورت یہ ہے کہ آپ ۱۹۳۸ء سے لے کر (جب اسکی زندگی کا آغاز ہوا تھا) حالیہ اشاعت تک کے پرچوں کا جائزہ لیجئے، ان میں آپ کو کہیں تضاد نظر نہیں آئے گا۔ اس نے جو بات ۱۹۳۸ء میں کہی تھی، وہی بات آج بھی کہہ رہا ہوگا۔ اس اعتبار سے طلوعِ اسلام، کبھی بھی عہدِ پارینہ کی داستان نہیں بنے گا۔ یہ ہمیشہ زندہ اور تازہ نظر آئے گا۔ بنابریں، اگر اس کی سابقہ اشاعتوں میں سے کچھ اقتباسات یا مضامین دوبارہ پیش کئے جائیں گے تو وہ ماضی کی تاریخ نہیں ہوگی۔ ان کا انطباق حال کے مسائل پر بھی یکساں ہوگا۔ یہ وجہ ہے جو ہم اس کے سابقہ مشمولات کو عند الضرورت دہراتے بھی رہتے ہیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر اس کی سابقہ تاریخ کے اہم مشمولات کو زیرِ نظر جائزہ میں پیش قارئین کیا جا رہا ہے۔ ویسے بھی، اس کے دورِ پاکستان کے پینتیس سال کے عرصہ میں ہزار ہا نئے قارئین کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کے لئے یہ مشمولات ویسے

بھی نئے اور تازہ ہوں گے۔ اور قدیم قارئین کے لئے بادۂ دوشینہ کی یاد دہانی۔

اب دیکھئے اس کے ماضی کے احوال و ظروف کے چند اہم نقوش، جنہیں ۱۹۶۲ء میں نمایاں کیا گیا تھا۔

اربابِ حکومت کے نام

طلوعِ اسلام نے جنوری، فروری ۱۹۴۸ء کے شمارہ (یعنی دورِ پاکستان کی اوّلین اشاعت) میں حکامِ پاکستان کو بیداری کا پیغام دیتے ہوئے لکھا:-

"انگریز چلا گیا لیکن اس کے نظامِ حکومت نے تمہارے قلب و دماغ کو جن سانچوں میں ڈھال دیا تھا تم نے انہیں بدستور قائم رکھا ہے بلکہ وہ کمزوریاں جو پہلے پھر بھی کسی حد تک انگریز کے خوف یا شرم سے دبی دبی سی رہتی تھیں، ابھر اور نکھر کر اور آگئیں۔ خارجی دنیا میں پوری کی پوری بساطِ سیاست و حکومت بدل گئی لیکن تمہارے قلب و نگاہ کی دنیا میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہی اپنوں سے بیگانگی و مغائرت، وہی مصنوعی رعب و داب، وہی خوشامد پرستانہ مسلک، وہی فریب کارانہ مشرب، وہی حیلہ جوئی اور کام چوری، وہی نالائقی اور نااہلی، وہی خیانت و بددیانتی، وہی اعزّہ پروری و جنبہ داری، وہی ظلم و استبداد، وہی جور و ستم، کوئی داد خواہ نہیں جو تمہارے ہاتھوں نالاں نہ ہو۔ کوئی ستم رسیدہ نہیں جو تمہاری نازیبائی سلوک کا شکوہ سنج نہیں....

یاد رکھو! اگر تم نے خود اپنے آپ کو نہ بدلا تو خدا کا نہ بدلنے والا قانون تمہیں بدل دے گا اور اس کا بدلنا ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تختہ اُلٹ جایا کرتا ہے۔"

اعیانِ ملت سے

اس کے بعد اس نے اعیانِ قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ:-

۱۔ بھک سے اُڑ جانے والے جذبات سے الگ ہو کر، ٹھنڈے دل سے تمام حالات کا جائزہ لیا جائے اور مختلف اسباب و علل کا صحیح صحیح تجزیہ کیا جائے۔ جو جو غلطیاں ہم سے ہوئی ہیں اُن کا کشادہ ظرفی سے اعتراف کیا جائے اور اس طرح اسے آئندہ اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔

۲۔ اس خطۂ ارض کے تحفظ و استحکام کا پورا پورا سامان کیا جائے جسے اللہ نے اپنی ذرہ نوازیوں کے صدقہ ہماری وراثت میں دے دیا ہے اور جس میں ہمیں ایسی امکانی قدرت حاصل ہوئی ہے کہ ہم چاہیں تو یہاں قرآنی تصورات کے مطابق اپنی دنیا کی تشکیل کریں۔

۳۔ منافقین کے اس طائفہ کو جو کسی نہ کسی طرح تپ دق کے جراثیم کی طرح ہماری ہڈیوں کے گودے کے اندر تک پہنچ چکا ہے اور اب ناصحینِ مشفق کے لباس میں دشمن کی سازشوں کو کامیاب بنانے میں مصروف ہے، جلد از جلد بے نقاب کر کے اپنوں سے الگ کیا جائے۔

۴۔ جو نالائق اور بددیانت گروہ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسندِ اقتدار پر متمکن ہو چکا ہے اُسے اس کی صحیح قدر و قیمت کا آئینہ دکھا کر اس کے اصلی مقام تک لوٹا دینے کا انتظام کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی نوجوان طبقہ کی تطہیرِ فکر اور تربیتِ قلب اس انداز سے کی جائے کہ وہ حکومت

کے بارِ عظیم کے اہل ہو جائیں۔

۵۔ گزشتہ حوادث و نوازل نے قوم کی اقتصادی حالت کو جس درجہ پست کر دیا ہے اس کا صحیح اندازہ کر کے اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع پر غور کیا جائے۔

۶۔ اس انقلاب کو جو اس وقت ضمیرِ عوام میں پہلو بدل رہا ہے صحیح خطوط پر متشکل کر کے ایسی صورت پیدا کی جائے کہ یہ انقلابی روح، صحیح قیادت اور متعین منزل کے فقدان سے، تعمیری نتائج مرتب کرنے کے بجائے مزید تخریب و اختلال کا موجب نہ بن جائے اس کے لئے عوام کے قلب و نگاہ کی تربیت منزلِ مقصود کا واضح اور غیر مبہم تعین اور اس تک پہنچانے والے صراطِ مستقیم کی روشن نشاندہی کی جائے۔

۷۔ اربابِ اقتدار کو بتایا جائے کہ وہ اپنا نصب العین، جذبۂ حکومت کی تسکین کے بجائے فریضۂ خدمت کی ادائیگی قرار دیں اور عوام کو سمجھایا جائے کہ وہ اپنے حقوق کے مطالبہ کے ساتھ اس اہم حقیقت کو بھی فراموش نہ کریں کہ ان کے صرف حقوق ہی نہیں بلکہ کچھ فرائض بھی ہیں، اور حقوق و مواجب کا مستحق بھی وہی ہوتا ہے جو اپنے فرائض کو بطریقِ احسن بجا لائے۔

۸۔ جو خطرہ اس وقت سر پر منڈلا رہا ہے اس کی مدافعت کے لئے پوری کی پوری قوم کو تیار کیا جائے اس لئے کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی نہ رہا تو ہم بھی نہ رہ سکیں گے۔

۹۔ اور ان مساعی کا ماحصل یہ ہو کہ جس غرض کے لئے یہ زمین کا ٹکڑہ ہم نے حاصل کیا ہے، وہ غرض بطریقِ اتم پوری ہو جائے۔ اور وہ غرض اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس خطۂ زمین میں بسنے والا مسلمان تمام دنیا کی غیر فطری غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر فقط ایک اللہ کا محکوم ہو کر زندگی بسر کر سکے اور اس طرح پھر سے اس آئینِ کہن کو تازہ کر دے جسے چشمِ فلک نے ایک بار دیکھا اور اسے دوبارہ دیکھنے کیلئے آج تک سرگرداں ہے"

نظریۂ قومیت

ہندوستان میں مسلمانوں کا مطالبۂ آزادی اس دعویٰ پر مبنی تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے مسلمان ایک الگ قوم کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسری قوم کے افراد۔ یہ دعویٰ اس مطالبہ کی تائید میں بطور ایک وکیلانہ حربہ کے استعمال نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک حقیقتِ نفس الامری پر مبنی تھا اور وہ حقیقت یہ تھی کہ اسلام نے تمام مدعیانِ ایمان کو، بلا امتیازِ حد و مکانی ایک قوم قرار دیا ہے۔ یہ نظریۂ قومیت دینِ اسلام میں مسلمہ اصولِ اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس طرف توجہ دلاتے ہوئے طلوع اسلام نے لکھا:

"ہمیں اپنے عوام پر پورا اعتماد ہے کہ وہ تحریکِ پاکستان کے دوران بھی اسلامی مطالبہ کے پرزور حامی تھے، اور اب بھی ایک صحیح اسلامی معاشرے کا قیام دل سے چاہتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہم نے ان کی تعلیم و تربیت پر کوئی توجہ نہیں دی، نہ ہی اس تصورِ پاکستان کے زندہ رکھنے اور عام کرنے کا کوئی انتظام کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس تصور کو عام اور اس سے فضا کو اس طرح معمور کر دیا جائے کہ ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اسے

جذب کر لیا جائے تو آج بھی اسلام کا رشتہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ایک مستحکم وحدت اور یگانگت کا موجب اور مغربی پاکستان میں سندھی اور پنجابی کے امتیاز کو مٹا کر ملی برادری کا محکم ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو ہمارے اجتماعی ایمان کا مرکزی نقطہ ہے۔ اسی میں ہماری نجات و سعادت کا راز مضمر ہے۔ اسی سے پاکستان کا استحکام وابستہ ہے اور یہی ہمارے تمام دکھوں کا واحد علاج ہے۔ جن لوگوں نے پاکستان کو اس لئے حاصل کیا تھا کہ یہ اسلام کی تجربہ گاہ بن سکے ان کے کرنے کا کام یہی ہے کہ اس تصور کو زیادہ سے زیادہ حد تک عام کیا جائے۔ حقیقت میں یہ کام حکومت کے کرنے کا تھا لیکن حکومتیں آتی اور جاتی رہیں مگر اس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی۔" (طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۵۷ء صفحہ)

نظریۂ پاکستان

اسلامی نظریۂ پاکستان کی اصطلاح کے اس قدر کثرت کے ساتھ استعمال ہونے کے باوجود آج تک یہ متعین نہیں کیا گیا کہ اس سے مراد کیا ہے۔ چنانچہ اب بھی یہ اصطلاح مبہم کی مبہم ہے۔ اس اصطلاح کی تفصیلات تو طول طویل ہیں لیکن اصولی طور پر اس کا مفہوم طلوعِ اسلام نے دو شقوں میں متعین کرتے ہوئے لکھا:

۱۔ "اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے نہ کہ نسل اور وطن کا اشتراک۔ اس معیار کے مطابق ایک ہی مملکت میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ غیر مسلم، مسلم قومیت کا جزو قرار نہیں پا سکتے۔ یہ اس بنیاد کی پہلی اینٹ تھی جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی تھی اور قرآنی نظامِ حیات کا اوّلین تصوّر۔

۲۔ مملکت کی آزادی اور پابندی کے حدود ان اصولوں کی رُو سے متعین ہوں گے جو خدا کی کتاب (قرآن مجید) میں محفوظ ہیں اور جن میں کسی قسم کا ردّوبدل نہیں ہو سکتا۔ بالفاظِ دیگر اسلامی مملکت، قرآنی احکام و اصول کی حکمرانی کی ایجنسی ہو گی۔"

دستورِ پاکستان

طلوعِ اسلام کے سامنے سوال یہ تھا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے پہلا قدم اسلامی دستورِ مملکت کی ترتیب و تدوین کا ہو گا۔ ضروری تھا کہ اس کے لئے ذہنوں کو ہموار کیا جائے اور اس کے راستے میں جو الجھاؤ اور پیچیدگیاں حائل ہونے والی ہیں انہیں رفتہ رفتہ صاف کر دیا جائے تاکہ جب اس نظام کی عملی تشکیل کا وقت آئے تو اس کی ترتیب میں دقت پیش نہ آئے۔ چنانچہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی بننے کے بعد اس نے اراکینِ مجلسِ آئین ساز کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

"پاکستان سرِدست ایک قطعۂ زمین ہے جس پر جس قسم کی عمارت ہم چاہیں تعمیر کی جا سکتی ہے۔ اس عمارت کا نقشہ مرتب کرنے اور سنگِ بنیاد رکھنے کا کام آپ کو تفویض کیا گیا ہے۔

لہٰذا سوچئے کہ کس قدر اہم ہے آپ کا فریضہ اور کتنی عظیم القدر ہے آپ کی ذمہ داری۔ اس نقشہ کی ایک ٹیڑھی لکیر اور اس سنگِ بنیاد کا ذرا سا غلط رُخ ساری کی ساری عمارت کو کچھ سے کچھ بنا دے گا۔ اس لئے غور کیجئے کہ آپ کو کس قدر حزم و احتیاط اور کس درجہ بصیرت و فراست سے کام لینا ہے! آپ میں ایسے افراد بھی ہیں جن کے

ذہن میں سوائے مغربی ایوانوں کے اور کسی عمارت کا نقشہ نہیں اور ایسے بھی جن کی نگاہیں بار بار ہندوستان کے بتکدوں کی طرف اٹھتی ہیں۔

لیکن، اسلام کا مطالبہ آپ سے کچھ اور ہے:

وہ حریم پاکستان کی بنیادوں کو ان خطوط پر متشکل کرنے کا تقاضا کرتا ہے جن کی ابتداء آج سے پانچ ہزار سال پیشتر خطۂ حجاز کی بے برگ و گیاہ زمین پر، ملت حنیفہ کے موسس اعلیٰ حضرت خلیل اکبرؑ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور جن کی تکمیل جناب مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کے دست مطہر سے انجام پائی۔ جو دنیا میں خدا کا پہلا گھر کہلایا اور ارتقائے شرف انسانیت کا منتہیٰ ٹھہرا۔ اسلام اسی نمونے کی عمارت چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ تاسیس کا نہیں تجدید کا ہے وہ آپ سے کوئی نیا ضابطۂ قوانین مرتب کرانا نہیں چاہتا۔ وہ صرف اس ضابطۂ خداوندی کی تنفیذ چاہتا ہے جو مسلمان کے لئے قیامت تک ایک مکمل آئین زندگی اور دستور حیات ہے۔ اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است!

اوروں کے نزدیک آزادی سے مفہوم فقط اس قدر ہے کہ وہ اپنے لئے آپ قانون بنا سکیں۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی سے صرف یہ مفہوم ہے کہ وہ اپنے خدا کے قانون کو رائج کر سکیں۔ اس لئے اگر آپ نے اس قانون ابدی کے علاوہ کوئی اور قانون منتخب کیا تو مسلمان کے نزدیک یہ آزادی نہیں ہوگی، غلامی کی غلامی رہے گی۔ اور مسلمان کا سیاسی شعور اب اتنا بیدار ہو چکا ہے کہ وہ غلامی کی لعنتی زندگی سے رستگاری حاصل کر سکے خواہ وہ غلامی اپنوں ہی کی کیوں نہ ہو۔ قوم کیا کرے گی؟ اسے چھوڑو۔ لیکن آپ کے ساتھ کیا ہوگا اسے سوچو اور اس کے لئے خدا کی یہ وعید ہر وقت اپنے سامنے رکھو جو اس قسم کے لوگوں کے حق میں آئی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ — اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ..... وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔ (۱۴/۲۸-۲۹) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی عطا فرمودہ نعمت کو کفر سے بدل دیا اور اس طرح اپنی قوم کو امن و تسکین اور سرفرازی و سربلندی کی جنت کی طرف لے جانے کے بجائے تباہی اور بربادی کے گھر میں جا اتارا۔ یعنی جہنم میں جو ٹھہرنے کے لئے نہایت بری جگہ ہے۔" (جنوری، فروری ۴۸ء)

طلوع اسلام نے ان کار فرماؤں کے اس طبقہ کی نشاندہی کی جو تمام مواعید کو پس پشت ڈال کر اسلامی دستور سے گریز کی راہیں اختیار کر رہا تھا اور سیکولرازم کی حمایت میں مکروہ سازشیں بروئے کار لا رہا تھا۔ ان عناصر کے چہروں سے دلفریب نقاب اٹھاتے ہوئے طلوع اسلام نے اپنی مارچ ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا:۔

منافقین سے

”اول الذکر گروہ سے جو“ ایماندار..... بے ایمانوں“ پر مشتمل ہے“ خطاب مقصود ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نظریں جلوۂ دانش فرنگ سے خیرہ کر رکھی ہیں اور جن کی نگاہوں میں کوئی ایسی چیز جچ نہیں سکتی جس پر لنڈن یا ماسکو کی مہر ثبت نہ ہو۔ ان کے نزدیک کوئی ایسا نظام قابل قبول نہیں ہو سکتا جو مغربی مادہ پرستی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔

دوسرا گروہ، وہ ہے جسے ہم ”بے ایمان ایماندار“ کہہ سکتے ہیں۔...... یہ گروہ یا تو بزدل ہے کہ اپنے دلی معتقدات کے اظہار سے ڈرتا ہے یا فریب کار کہ اپنے موجودہ دنیاوی مراتب کو برقرار رکھنے کے لئے وہ بات کہتا ہے جس میں اسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی امید ہو سکتی ہے...... اس پر ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام یا قرآن سے ان لوگوں کی والہانہ شیفتگی ایک فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ انہوں نے عوام کی نازک رگ کو

پہچان لیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام کے ذہن اس چیز کو سننے اور برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو ان کے قلوب کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ ان لوگوں سے ہم گذارش کرینگے کہ وہ قوم سے مذاق کرنا چھوڑ دیں۔ ان کی قیادت کے ایوان ریت کے ستونوں پر استوار نہیں رہ سکتے، اس لئے وہ جس قدر جلد اس فریب کاری طمع سازی اور منافقت کو ترک کر دیں بہتر ہے۔"

فرد اور ملّت کے روابط

اسلامی نظام کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے طلوع اسلام نے فروری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں لکھا:۔

"آجکل "اسلامی نظام" کا عام چرچا ہو رہا ہے اور پاکستان کے دستور کا مسئلہ زیر بحث ہے۔ مختلف سمتوں سے کوشش ہو رہی ہے کہ یہ دستور ان کے منشایا ان کے تصورات کے مطابق مرتب ہو۔ لیکن آپ جس قسم کا جی چاہے دستور بنا لیجئے، یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہے گی کہ اسلامی نظام کی عملی تشکیل کی صورت صرف اسلامی تنظیم ہے۔ جب تک آپ پوری کی پوری ملّت کی تنظیم ان خطوط پر نہیں کرینگے۔ اسلامی نظام کبھی صورت پذیر نہیں ہو سکے گا۔ اسلامی نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ــــ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

جب تک افراد ملّت، اس نظام میں برابر کے شریک نہیں ہونگے۔ یہ اسلامی نظام نہیں ہوگا۔ اس نظام میں مرکز ملّت اور افراد ملّت میں غیر منقطع واسطہ ہونا ضروری ہے۔ اس میں، ہر فرد کی آواز مرکز تک پہنچنی چاہیئے اور مرکز کے فیصلے افراد کے ہاتھوں نفاذ پذیر ہونے چاہئیں۔ مرکز اور افراد کے درمیان کوئی حاجب اور دربان نہیں ہونا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے جب حکم دیا تھا کہ مصر کے گورنر نے اپنے مکان کے آگے جو ڈیوڑھی بنالی ہے، اُسے مسمار کر دیا جائے تو وہ حکم اسی حقیقت کی ترجمانی کر رہا تھا۔ وہی نظام، نظام خداوندی کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جس میں مرکز ہر فرد کی پکار سُنے اور اس کا جواب دے۔ جس نظام میں افراد ملّت اور مرکز کے درمیان دیواریں کھڑی ہو جائیں وہ نظام کبھی نظام خداوندی نہیں کہلا سکتا۔"

تھیاکریسی کے خلاف

قرارداد مقاصد پاس ہونے پر طلوع اسلام نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی جولائی ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں مشورہ دیا کہ:۔

"..... طلوع اسلام متعدد بار لکھ چکا ہے کہ مجلس آئین ساز نے قرارداد مقاصد پاس کر کے اپنے لئے اور اس سے آگے بڑھ کر قوم اور ملک کے لئے ایک مستقل فتنہ کا باب کھول دیا ہے۔ قرارداد مقاصد سے فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس کا فیصلہ کون کریگا کہ فلاں قانون کتاب و سنت یا شریعت اسلامی کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا کہ اس کے لئے ارباب شریعت یعنی مولوی صاحبان کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے لئے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی کہ مجلس مقننہ کے ساتھ علماء کا ایک بورڈ بھی ہونا چاہیئے جو یہ فتویٰ دیا کرے کہ زیر نظر مسئلہ میں شریعت کا کیا ارشاد ہے؟ گویا عملاً قانون سازی اور قانون کی تعبیر کے پورے اختیارات مولوی صاحبان کے ہاتھوں میں دے دیئے جائیں ..... ہم اس حقیقت کا بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ اگر حکومت کے کاروبار میں ملّا نے مؤثر اقتدار حاصل کر لیا تو تھوڑے عرصہ میں پاکستان کی حالت افغانستان سے بھی بدتر ہو جائیگی۔

دوسری طرف ہم یہ بھی بار بار کہہ چکے ہیں کہ جس قسم کا مذہب ملّا پیش کر رہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کا نوجوان طبقہ سرے سے مذہب ہی سے متنفر ہو جائے گا اور یہ کہہ اٹھے گا کہ مذہب ایک نجی مسئلہ ہے۔ اسے سیاست سے کوئی سروکار نہیں۔ اس خطرہ کے لئے ہمارے سامنے ترکی کی مثال موجود ہے۔ وہاں کے ارباب اقتدار کا یہ منشا ہرگز نہیں تھا کہ مذہب کو مملکت سے الگ کر دیا جائے۔ لیکن جس قسم کا مذہب علماء کی طرف سے پیش کیا جاتا تھا، وہ قطعاً اس قابل نہیں تھا کہ مملکت کے کاروبار کو ایک دن کے لئے بھی چلنے دے۔ وہاں کے ارباب بست کشاد نے تنگ آکر یہ فیصلہ کر دیا کہ ایسے مذہب کو حجروں اور خانقاہوں تک محدود رہنا چاہیئے۔ مملکت کا کاروبار مملکتی طریقوں پر سرانجام پائے گا۔"

غیر مسلموں کی حیثیت

مجلس قانون ساز میں غیر مسلموں کی شرکت اور مشاورت کے متعلق طلوع اسلام نے حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے لکھا:-

"ہم اس حقیقت کو پھر دہرائے دیتے ہیں کہ ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو آئین و قانون کے کاموں میں کبھی شریک نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کے آئین کے معاملہ میں اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔" (دسمبر ۵۵ء)

اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے طلوع اسلام نے لکھا:-

"اسلامی مملکت کی مجلس قوانین سازی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قرآنی اصولوں کی حدود کے اندر مملکت کے تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کرے۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ (یعنی غیر مسلم) قرآنی اصولوں کی صداقت کے قائل ہی نہ ہوں انہیں ان اصولوں کے مطابق قوانین سازی کے کام میں شریک کرنا قرآنی اصولوں کا مضحکہ اڑانا اور خود ان لوگوں کا منہ چڑانا ہے۔ جو ان اصولوں کو مانتے ہیں...... ہمیں امید ہے کہ زیر تجویز کانسٹی ٹیوشن اس مسئلہ کو کما حقہٗ اہمیت دیگا اور اپنی سفارشات میں اس امر کی وضاحت کر دیگا کہ پاکستان کا آئین اسلامی آئیڈیالوجی پر مبنی ہے اس لئے جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے وہ ان لوگوں کے ساتھ اصولی طور پر کس طرح شرکت کر سکتے ہیں۔ جو اس آئیڈیالوجی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔"

دستورِ پاکستان

دستور حیات کا انتخاب درحقیقت کسی قوم کے ارادوں کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں طلوع اسلام نے نہایت وضاحت سے فیصلہ کن انداز میں حکومت کو یاد دہانی کراتے ہوئے لکھا:-

"...... مستقبل کا فیصلہ اس امر پر موقوف ہے کہ یہ اپنے لئے کس قسم کا دستور حیات تجویز کرتے ہیں۔ اس لئے کہ دستور حیات کا انتخاب درحقیقت کسی قوم کے ارادوں کا آئینہ ہوتا ہے۔ ایک دستور حیات وہ تھا جو انہیں ابدی حقیقتوں کی شکل میں دیا گیا اور جس پر حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پاکباز رفقاءؓ کی جماعت نے عمل کر کے دنیا کے سامنے زندگی کا صحیح معیار پیش کر دیا۔ دوسرا دستور حیات وہ تھا جسے یہودیوں کے موسموں، عیسائیت کی خانقاہوں اور مجوسیوں کے آتشکدوں کے اقنوم ثلاثہ نے مرتب کیا اور ملوکیت، ملائیت اور پیر پرستی کے نگاہ فریب پردوں میں چھپا کر مسلمانوں کے قلب و دماغ پر مسلط کر دیا۔ یہ وہ دستور حیات ہے جو قرن اوّل کے بعد سے اس وقت تک جسدِ ملّت سے زندگی کی حرارتوں کو سلب کرنے کا موجب بنا رہا ہے اور جسے رجعت پسند عناصر مذہب کے مقدس

بانس میں پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مسلمان اس دستور کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنانا چاہتا ہے جسے محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ نے تیار کیا تھا، اور اس سے وہ شہداء علی الناس (تمام نوع انسانی کے نگران) کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گئے تھے یا اس دستور کو اختیار کرنا چاہتا ہے جو عجمی سازشوں کا وضع کردہ، ان کے عہد ملوکیت کی یادگار اور رجعت پسند عناصر کی خوئے مردہ پرستی کی تسکین کا موجب ہے اور جس نے اس قوم کو زندگی اور اس کی حرارتوں سے اس طرح محروم کر رکھا ہے۔ کَاَنْ لَّمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا۔

یہ سوال بڑا صاف اور نکھرا ہوا ہے اور اسی کے جواب پر پاکستان کے مسلمانوں کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ اگر انہوں نے اس دستور کو اپنا ضابطۂ حیات تجویز کر لیا جس کی بنیاد قرآن کی ابدی صداقتوں پر ہے تو انہیں ان کی کھوئی ہوئی عظمتیں اور لٹی ہوئی نعمتیں پھر سے مل جائیں گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ اقوام عالم کی امامت کے بھی شایان شان قرار پا جائیں۔

(فروری ۱۹۵۱ء)

اسلامی آئین کے اصول و مبانی

اسلامی آئین کی ترتیب کے سلسلہ میں طلوع اسلام نے اس کے طریق کار کی تفصیلی طور پر نشاندہی کرتے ہوئے اپریل ۱۹۵۹ء کے شمارہ میں حکومت کو مشورہ دیا:۔

۱۔ پاکستان کے لئے اسلامی آئین کا مرتب کر لینا کچھ مشکل نہیں، بشرطیکہ اس مسئلہ کو صحیح خطوط پر سمجھا جائے اور اس کے لئے صحیح راستے پر اقدامات کئے جائیں۔

۲۔ اس کے متعلق یہ خیال دل سے نکال دیا جائے کہ (اسلامی آئین) ہمارے مذہبی پیشوا مرتب کریں گے اور اس کی ترتیب و تدوین میں ان کا عمل دخل ناگزیر ہے۔ اگر ہم نے ایسا سمجھ لیا تو اسلامی آئین قیامت تک بھی مرتب نہیں ہو سکے گا۔

۳۔ اسلامی آئین، قرآن کے غیر متبدل قوانین (مستقل اقدار) کے مطابق مملکت کا منتہیٰ و مقصود متعین کرے گا اور اس کے حصول کے لئے حدود و شرائط کی نشاندہی کرے گا۔ ان حدود و شرائط کے اندر رہتے ہوئے، عملی اقدامات ملت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔

۴۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو پاکستان کی آئیڈیالوجی اور اسلامی مملکت کے اصول و مبانی کے متعلق (فرقہ وارانہ اثرات سے بلند ہو کر) تحقیق کرے اور اس کی سفارشات کی روشنی میں آگے قدم اٹھایا جائے۔

۵۔ ملک سے مذہبی فرقہ وارانہ تقسیم کو ختم کر کے، اُمّتِ واحدہ کی تشکیل، مملکت کا فریضہ قرار پائے اور اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچا جائے۔ اس کا مؤثر اور کامیاب طریق یہ ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلی پیدا کریں۔ جداگانہ مذہبی مدارس اور دارالعلوموں کو ختم کر کے، صحیح دینی تعلیم، مدرسوں اور کالجوں میں دی جائے اور اس کی بنیاد قرآن کریم اور اس کی روشنی میں اسوۂ حسنۂ نبی اکرمؐ کو قرار دیا جائے۔

مذہبی پیشواؤں کی معاش کا مسئلہ

۶۔ ہمارے موجودہ ارباب مذہب کی روزی کا باعزت اور معقول انتظام کیا جائے اور انہیں اس قسم کے خیالات کے نشر و اشاعت

کی اجازت قطعاً نہ دی جائے جن سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھے اور مذہبی گروہ بندی کی گرہیں مضبوط ہوتی جائیں۔"

طلوع اسلام نے اپنے اسی شمارے میں لکھا:۔

اگر یہ تجربہ ناکام رہا تو.....

"آئین کا معاملہ بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کا تعلق قوم کی پوری زندگی اور آنیوالی نسلوں کے مستقبل سے ہے۔ نہ ہی یہ مذہبی مناظرہ ہے کہ اس میں لفظی گورکھ دھندوں سے اپنے متبعین کو خوش کر لیا جائے۔ یہ ایک ٹھوس تجربہ ہے جسے (تیرہ سو سال کے بعد) پہلی مرتبہ عمل میں لایا جا رہا ہے اور جس کی طرف ساری دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو دنیا اس نتیجہ پر پہنچے گی کہ اسلام ایک ممکن العمل ضابطۂ زندگی ہے جو آج بھی اپنے نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ اگر یہ ناکام رہا تو دنیا ہمارے متعلق جو رائے قائم کرے سو کرے) خود اسلام کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ یہ کسی دور میں تو قابلِ عمل تھا لیکن اب اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ یہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اندریں حالات یہ مسئلہ سطحی جذبات کی رُو سے طے کرنے کا نہیں، کامل غور و فکر اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ حل کرنے کا ہے۔"

آئین کے مسودات

واضح رہے کہ آئین سازی کے سلسلہ میں طلوع اسلام نے اتنا ہی نہیں کیا کہ ارباب حکومت اور مجالس دستور ساز کو ضروری مشورے دیئے۔ اس نے ہر آئین ساز اسمبلی کو اسلامی دستور پاکستان کے مکمل اصول و ضوابط مرتب کر کے دے دیئے اور انہیں ہزاروں کی تعداد میں ملک میں پھیلا دیا۔ اس نے موجودہ آئین ساز اسمبلی کے لئے اسی قسم کا آئین مرتب کر کے دے دیا ہے اور اس کی اشاعت بھی عام کی ہے۔ اس دستور کا کتابچہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا گیا ہے۔

مخلوط انتخاب

مخلوط انتخاب نظریۂ پاکستان کی ضد ہے اور دو قومی نظریہ کے علی الرغم۔ ہمارے سربراہوں نے ایک طرف عملی طور پر اسے تسلیم کر لیا اور دوسری طرف وہ عوام کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے رہے کہ وہ قائداعظمؒ کے وارث اور نظریۂ پاکستان کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اس کھلی منافقت پر تنقید کرتے ہوئے طلوع اسلام نے اپنی نومبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھا:۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ان ذہنوں کے متعلق کیا کہا جائے۔ جن میں مخلوط انتخاب کا یہ باطل افروز تصور پیدا ہوا۔ ان زبانوں کے متعلق کن الفاظ میں گفتگو کی جائے جنہوں نے اس اسلام سوز فتنے کو آگے پھیلایا، اور ان ہاتھوں کا ذکر کس انداز سے کیا جائے جو اس زہر آلود خنجر کو سینۂ ملت میں پیوست کرنے کے لئے یوں بے تابانہ اٹھ رہے ہیں.... اگر دستور میں مخلوط انتخاب جیسے غیر اسلامی تصورات کو ٹھونس دیا گیا تو ہم واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ یہ روش زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکے گی.... اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کے باوجود جس دستور کو آپ اسلامی کہہ کر مرتب کریں گے قوم اسے اسلامی سمجھ کر سر آنکھوں سے لگا لے گی تو یہ آپ کو بھول ہے۔"

وحدتِ ملت

ہندوستان میں مسلمانوں کا مطالبۂ آزادی اس دعویٰ پر مبنی تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے مسلمان ایک الگ قوم کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسری قوم کے افراد۔ یہ دعویٰ اس مطالبہ کی تائید میں بطور ایک وکیلانہ حربہ کے استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک حقیقتِ نفس الامری پر مبنی تھا۔ اور وہ حقیقت (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) یہ تھی کہ اسلام نے تمام مدعیانِ ایمان کو بلا امتیازِ حدود و مکانی ایک قوم

قرار دیا ہے۔ طلوعِ اسلام نے اس دعویٰ کی تائید میں قرآنی شہادت دیتے ہوئے اربابِ حکومت کی توجہ دلاتے ہوئے لکھا:۔

"وحدتِ ملت کے ضمن میں ایک نقطہ ایسا ہے جس کی طرف اربابِ حکومت کی توجہ خاص طور پر دلانا ضروری ہی نہیں بلکہ اشد ضروری ہے۔ اس حقیقت کو ہم میں سے ہر شخص دن میں دس مرتبہ دہراتا ہے کہ اسلام نسب، نسل، قوم، وطن، رنگ، زبان کے امتیازات کو مٹا کر معیارِ تکریم صرف جوہرِ ذاتی و تقویٰ کو قرار دیتا ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی تعلیم ہے اور قرآن کی نصِ صریح۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں دو رائے ہو نہیں سکتیں۔"

طلوعِ اسلام نے حکومتِ پاکستان کو مشورہ دیتے ہوئے دسمبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں تحریر کیا:۔

صوبائیت کی لعنت

"اگر آپ دل سے چاہتے ہیں کہ پاکستان قائم ہو جائے تو بنیادی طور پر چند تبدیلیاں فوری کرنی پڑیں گی۔

۱۔ تمام صوبوں کو توڑ کر ساری مملکت کو مرکزی نظام کے ماتحت لے آئیے۔ اس سے وہ طبقہ جو محض پارٹیوں کے زور پر برسرِ اقتدار آ گیا ہے اور اب شجرِ حکومت پر اکاس بیل کی طرح چھا رہا ہے (کہ بیل تو تر و تازہ ہو رہی ہے اور درخت دن بدن سوکھتا جا رہا ہے) الگ ہو جائے گا اور ساتھ ہی اخراجاتِ حکومت میں بڑی کفایت ہو جائے گی۔

۲۔ مرکزی کابینہ کو وسیع کیجئے لیکن معیارِ انتخاب یہ رجحان نہ قرار پائے کہ کس کے تعین سے کونسی پارٹی خوش ہو گی۔

۳۔ ایک ایک منسٹر کے ساتھ کم از کم چار چار نوجوان تعلیم یافتہ صاحبِ دل و دماغ سیکرٹری ملحق کر دیجئے۔

۴۔ فنی شعبوں کو محض منسٹروں تک ہی محدود نہ کیجئے پبلک میں سے صاحبِ درک لوگوں پر مشتمل مجالس شوریٰ متعین کیجئے تاکہ تمام امور میں منسٹروں کو مشورہ دے سکیں۔

۵۔ یہ سمجھ لیجئے کہ ہم زمانۂ جنگ سے گزر رہے ہیں اس لئے کام کی رفتار اسی نہج سے مقرر کیجئے۔

۶۔ مرکز کے موجودہ افسروں کو بتدریج اضلاع میں تبدیل کر کے ان کی جگہ نئے افسر متعین کیجئے۔ اطلاعات کے مطابق یہاں پارٹی بازی اس قدر شدید اور محکم صورت اختیار کر چکی ہے کہ اگر کچھ وقت اور یہی صورتِ حال رہی تو حکومت کی مشینری خود کارپردازانِ حکومت کے ہاتھوں سے تہس نہس ہو جائے گی۔

۷۔ قوم پاکستان کے تحفظ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہے لیکن قوم کا اعتماد حاصل کرنے اور ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش اس وقت تک نہیں کی گئی۔ اس کی طرف فوری توجہ دیجئے۔

۸۔ عسکری تربیت (ملٹری ٹریننگ) لازمی کر دیجئے۔"

۱۹۴۸ء میں حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا کہ مرکزی حکومتوں کی ملازمتوں میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی نیابت الگ الگ ہو اور تمام اسامیاں دونوں خطوں کے مسلمانوں میں نصف نصف بانٹ دی جائیں۔ چنانچہ صوبائی تقسیم کے اس شجرِ ملعونہ اور حکمتِ فرعونی کے اس ابلیسی کارنامہ پر طلوعِ اسلام نے تنقید کرتے ہوئے متنبہ کیا اور اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا:۔

صوبوں کو ختم کر دیجئے

"یاد رکھئے! ہماری محکم اور پائندہ حکومت اسی صورت میں قائم ہو سکے گی جب ہم

ان صوبائی نسبتوں سے بلند ہو کر صرف اسلامی نسبت کو پیش نظر رکھیں اور کسی کو کبھی خیال تک بھی نہ گزرے کہ فلاں شعبہ میں ہماری نمائندگی کس قدر ہے۔ صوبوں کی لکیریں محض نظم و نسق کی سہولت کی خاطر کھینچی گئی تھیں، نہ کہ ملک کے باشندوں میں تفریق پیدا کرنے کے لئے، اگر یہ لکیریں اس قسم کی تفریق کے خطوط بن رہی ہیں تو ان لکیروں کو جس قدر جلد مٹایا جائے اتنا ہی اچھا ہے تاکہ ــــ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

ملت میں تفرقہ انگیزی کا بنیادی سبب صوبوں کا وجود ہے۔ صوبے ہمارے لیڈروں کی ہوس اقتدار اور حرص مناصب و مدارج کو بڑھانے کا موجب بنے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے مفادات کی غرض سے ملک کو صوبوں میں تقسیم کیا تھا"

ملک میں فیڈرل طرز کی حکومت کی تشکیل کی آوازیں بلند ہوئیں تو طلوع اسلام نے مارچ ۱۹۵۳ء میں تجویز پیش کی:-

فیڈرل حکومت کے خلاف

"فیڈرل انداز حکومت غیر اسلامی صوبائی عصبیت کو مضبوط بنانے کا ایک مستقل ذریعہ ہے۔ یہ انداز اسلام کے مزاج کے یکسر خلاف ہے۔۔۔ پاکستان میں فیڈرل انداز کی حکومت سے صوبائی قومیتیں آہستہ آہستہ مستند ہو جائیں گی اور اس چھوٹے خطہ زمین میں بھی مسلمانوں کی وحدت قائم نہ ہو سکے گی چہ جائیکہ ساری دنیا کے مسلمانوں میں وحدت قائم ہو جائے جو اسلام کا منشاء ہے"

محترم پرویز صاحب نے ۱۹۵۳ء میں مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ وہاں کے حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد موصوف نے جن حقائق کی نشاندہی اکتوبر ۱۹۵۳ء کے طلوع اسلام میں کی، وہ یہ تھی:-

مشرق و مغرب میں کانفیڈریشن

"اب ہمارے خیال میں صورت حال ایسی پیدا ہو چکی ہے کہ وحدانی انداز کی حکومت بھی شاید کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لئے اب ہماری تجویز یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو دو خود مختار وحدتیں تسلیم کر کے ان میں کانفیڈریسی پیدا کر دی جائے جس میں تراضی مابین سے مشترکہ مسائل اکٹھے رکھ لئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ملا کر پورے ملک میں ایک حکومت قائم کی جائے"

پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی اندرونی اور بیرونی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے طلوع اسلام نے ملک کے ارباب بست و کشاد سے درخواست کی کہ وہ اس ڈھونگ کو ایک بڑا فتنہ بننے سے پہلے کچل دیں۔ اس نے اپنی ۱۵۔ نومبر ۱۹۵۵ء کی ہفت روزہ اشاعت میں لکھا:-

تحریک پختونستان

"تحریک پختونستان کے سلسلہ میں بیرونی ممالک میں کیا کچھ کیا جا رہا ہے اور اس کے پردے میں پاکستان کے خلاف کس قدر زہر پھیلایا جا رہا ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ حکومت پاکستان نے اس زہر آلود پروپیگنڈا کے ازالہ کے لئے کیا کچھ کیا ہے اور کیا کچھ کر رہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اب اس مسئلہ کو محض ایک مقامی مسئلہ سمجھ کر اس کی طرف سے بے اعتنائی نہیں برتنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتنہ عالمگیر بھی ہے اور زمین گیر بھی، لہٰذا اس کے انسداد کے لئے اسی قسم کی عالمگیر کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں افغانستان نے

جو رویہ اختیار کر رکھا ہے، وہ خود اس امر کی شہادت ہے کہ ڈاکٹر اورنگ شاہ نے جو کچھ ستمبر ۱۹۵۴ء میں کہا تھا وہ محض پروپیگنڈہ کا ڈھونگ نہیں تھا بلکہ حقیقت پر مبنی تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ کھچڑی اندر ہی اندر بہت دیر سے پک رہی تھی۔ اور اب اسے اس شکل میں باہر لایا جا رہا ہے۔ جیب انہیں بزعم خویش اس کا یقین ہو گیا ہے کہ اگر انہوں نے اس سوال کو آگے بڑھایا تو بعض گوشوں سے انہیں یقیناً اس کی تائید حاصل ہو جائے گی۔

ہم پاکستان کے ارباب بست و کشاد سے درخواست کریں گے کہ وہ کشمیر کے مسئلہ سے عبرت حاصل کریں اور اس نئے فتنے کے استیصال میں تعویق سے کام نہ لیں۔ مسئلہ کشمیر نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ ان معاملات میں تاخیر دشمن کے حق میں اور ہمارے خلاف جاتی ہے۔ لہٰذا، ضرورت ہے کہ اس کے متعلق ایک دفعہ بیٹھ کر پختہ فیصلہ کر لیا جائے اور پھر اس فیصلے پر عملدرآمد کرنے کے لئے پوری ہمت سے کام لیا جائے۔ یہ مسئلہ بھی کشمیر کے مسئلہ کی طرح پاکستان کی موت اور زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کا ہر بہی خواہ اس باب میں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہے گا۔"

مذہبی فرقہ بندی!

قرآن کریم کے واضح احکامات کے مطابق امت میں تفرقہ سازی شرک ہے۔ فرقہ سازی کی بنیاد شخصیت پرستی پر استوار ہوتی ہے۔ تفرقہ بازی میں ہمارے ملک کے علماء کو بڑا مقام حاصل ہے۔ طلوعِ اسلام نے اپنی جون ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں تحریر کیا کہ تفرقہ کو مٹانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس نے حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے لکھا:۔

"امت میں تفرقہ علماء کا پیدا کردہ ہے۔ اسی تفرقے میں ان کی اپنی ہستی کا راز پوشیدہ ہے۔ ان حضرات سے یہ توقع رکھنا کہ یہ تفرقہ مٹا کر وحدت پیدا کر دینگے، انتہائی خوش فہمی ہے۔ جو حضرات ان تمام مفسدہ انگیزیوں اور خونریزیوں کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کے باوجود، جو امت کے لئے وجہ ہلاکت بنتی چلی آ رہی ہیں اتنی سی بات پر بھی متفق نہ ہو سکے کہ نماز میں ہاتھ کھلے رکھنے چاہئیں، سینہ پر ہاتھ باندھنے چاہئیں یا زیر ناف۔ وہ اپنے تمام اختلافات مٹا کر ایک امت کیسے بن سکتے ہیں؟ جس زمانے میں پاکستان کا آئین زیر ترتیب تھا مختلف فرقوں کے (اکتیس[۳۱]) علماء کراچی میں جمع ہوئے تھے۔ یہ حضرات اپنے اس اجتماع کا تذکرہ بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ اس اجتماع میں انہوں نے ایک مطالبہ متفقہ طور پر پیش کیا تھا۔ وہ مطالبہ یہ تھا کہ ان کے مختلف فرقوں کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ سو ان حضرات کا اتفاق فرقوں کی گروہوں کو مضبوط کرنے کے لئے عمل میں آئے وہ فرقوں کو مٹا کر وحدت کس طرح پیدا کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے امت میں تفرقہ کو روکنے اور وحدت قائم رکھنے کی ذمہ داری افراد کے بجائے حکومت کے سر عاید کی ہے۔ یہ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ امت میں فرقے پیدا نہ ہونے دے اور جب پیدا ہو چکے ہوں تو انہیں ختم کر کے امت میں وحدت پیدا کرے۔ بظاہر یہ کام بڑا مشکل نظر آتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایسا مشکل نہیں۔"

قرآن ہی امت کی وحدت کی بنیاد بن سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ:۔

"۱۔ دین میں سند و حجت قرآن کو تسلیم کر لیا جائے۔

۲۔ جو کچھ اس وقت ہمارے ہاں مذہب کے نام سے مروج ہے، اسے قرآن کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے رکھ لیا جائے جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔

۳۔ قانون سازی کے سلسلہ میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ غیر متبدل قرآنی اصول (یا احکام) ہیں۔ اُمّت کو یہ حق حاصل ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، اپنے لئے جزئی قوانین خود وضع کرے۔ ان قوانین میں عند الضرورت تغیّر و تبدّل کیا جا سکے گا۔ لیکن قرآن کے اصول و احکام غیر متبدّل رہیں گے۔"

جمہوریّت اور اسلام

کہا جاتا ہے کہ اسلام سراسر جمہوریت ہے اور جمہوریت کے نشو و ارتقاء کے لئے سیاسی پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہے۔ ان پُرفریب نعروں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے طلوع اسلام اس موضوع پر بارہا قرآنی روشنی ڈالتا رہا ہے۔ مذہب اور مغربی جمہوریت کے نقاب میں ملک دشمن اور مفاد پرست طبقہ جسطرح سر اُبھار رہا ہے، ابتدا ہی سے طلوع اسلام نے حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ اس نے اپریل ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں حکومت کو مشورہ دیا تھا:۔

"ہم حکومت پاکستان کو ایک بار پھر متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ انہوں نے جمہوریت کا یہ مفہوم بالکل غلط سمجھا ہے کہ جن لوگوں کے متعلق یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ مملکتِ پاکستان کے کس قدر گہرے دشمن ہیں، انہیں پاکستان دوستی کے منافقانہ دعاوی کی آڑ میں اس قسم کی سازشوں کی اجازت دی جائے جس سے اس نوزائیدہ نظام کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں۔

کمیونسٹ

ضرورت ہے کہ جو کمیونسٹ عنصر نظم و نسق امورِ سلطنت میں کسی نہ کسی طرح دخیل ہو گیا ہے یا جو کمیونسٹ عنصر عوام کو آئین شکنی اور امن سوزی کے لئے بھڑکاتا ہے اور مظاہرات اور اشتعال انگیز اسباب و ذرائع سے حکومت کی مشینری میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرتا ہے، آہنی گرفت سے اس کا مقابلہ کیا جائے تاکہ قبل اس کے کہ اس کی جڑیں زمین گیر ہو جائیں اس فتنہ کا استیصال ہو جائے۔"

مغربی جمہوریت کی سیاہ کاریوں اور ان کے تباہ کن نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے طلوع اسلام نے بالتفصیل بارہا

سیاسی پارٹیاں

توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس نے حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی اہلیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:۔

"قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق دنیا میں دو ہی پارٹیاں تھیں مسلم اور غیر مسلم۔ خود مسلمانوں میں کسی پارٹی کا وجود یا تصوّر نہ تھا۔ وہاں ایک حزب اللہ تھی اور دوسری حزب الشیطان۔

ہمارے یہاں ایک بڑی بدنصیبی یہ بھی ہے کہ ہم مغربی تصوّرات میں اس حد تک کھو گئے ہیں کہ وہاں کے مروجہ نظامِ جمہوریت کی تنگنائے سے باہر نکل ہی نہیں سکتے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظام میں پارٹیوں کا وجود ضروری ہے تو پھر جمہوریت کے مغربی فلسفہ اور اس کے اسلامی تصوّر کا بنیادی فرق سمجھے بغیر، ہم یہ ہانک لگا دیتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی سیاسی پارٹیوں کا وجود اشد ضروری ہے۔ سوچئے کہ یہ کتنا بڑا فریب ہے خود اپنے ساتھ، اور کتنا بڑا کھیل ہے دینِ خداوندی کے ساتھ!

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ان تلخ تجربات کے تباہ کن نتائج ہماری نگاہوں کے سامنے آ چکے ہیں۔ ہمارے ہاں (اور مغرب میں بھی) پارٹیوں کا مسلک و مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہر معاملے میں حزبِ اقتدار کی مخالفت کی جائے اور جیسے بھی

ممکن ہو برسرِ اقتدار پارٹی کی حکومت کا تختہ الٹ کر اپنی پارٹی کی حکومت قائم کی جائے۔ اس مقصد و مسلک کے لئے ملک کی تمام پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف شب و روز نبرد آزما اور برسرِ پیکار رہتی ہیں اور پوری مملکت میں جنگ و جدل کا جہنم ہر لمحہ بھڑکتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا نظام، اسلامی تصورِ مملکت میں کبھی بار نہیں پا سکتا۔ ہم نے یہ جہنم بھڑکتا دیکھ لیا ہے۔ اس کے شعلوں میں پوری ملت کا امن چین بھسم ہو کر رہ گیا ہے۔ تقلیدِ مغرب کی اس خود فریبی میں ہمیں بدترین ایام دیکھنے پڑے۔ لیکن وائے برحالِ ما۔ کہ ہم اس سے اونی عبرت حاصل نہ کر سکے اور جونہی موقع ملا ماضی کے تلخ تجربات کو ایک بار پھر دہرانے کے لئے بے تابانہ میدان میں نکل آئے۔

ایک بار پھر سن لیجئے کہ اسلامی مملکت کے نظام کی بنیاد وحدتِ ملت پر ہے۔ اس نظام میں نہ تو کسی ایک پارٹی کی حکومت کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ کسی دوسرے کی نگرانی اور احتساب کا سوال۔ حکومت کا قیام پوری ملت کا مشترکہ فریضہ ہوتا ہے اور ہر فرد مملکت کو اس کی نگرانی کا حق حاصل ہوتا ہے۔" (اگست ۱۹۶۲ء)

مغربی جمہوریت اور اس کی مشینری ہمارے حالات کے قطعاً سازگار نہیں۔ اس کا مغز اسلام کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ عوام کے فیصلوں کی اطاعت قرآن کریم کی رُو سے شرک ہے اور شرک تذلیلِ انسانیت اور ہلاکت کا موجب۔ طلوعِ اسلام نے اس اصولی اور بنیادی بحث پر علی وجہ البصیرت اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا:۔

"مغربی جمہوریت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ ملک میں اقتدار (SOVEREIGNTY) عوام کو حاصل ہوتا ہے۔

اقتدارِ اعلیٰ

عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں اور جو فیصلہ عوام کے نمائندگان کی اکثریت کرے وہ ملک کا قانون قرار پاتا ہے جس کی اطاعت ہر ایک کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اختیارات سے بالا کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ جو جی میں آئے فیصلہ کرے اور جس قسم کا چاہے قانون وضع کرے۔

یہ تصور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے اس قسم کا اقتدارِ اعلیٰ کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ کچھ بنیادی اصول اور مستقل اقدار عطا کی ہیں جو قرآن میں محفوظ ہیں۔ ان اصول و اقدار میں کوئی فرد، کوئی ادارہ، کوئی حکومت، کوئی مملکت کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتی۔

ثبات و تغیر کا امتزاج

مملکتِ اسلامی ان اصول و اقدار کو برقرار رکھنے اور انہیں عملاً نافذ کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اس مملکت کو البتہ اس کا اختیار ہوتا ہے کہ ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے لئے جزئی قوانین مرتب کرے۔ یہ قوانین امت کے باہمی مشورے سے مرتب کئے جاتے ہیں۔ باہمی مشاورت کا اصول بھی قرآن کا مقرر کردہ اور غیر متبدل ہے۔"

(جنوری ۱۹۶۰ء)

نظریۂ ضرورت کا اسلام

ایک اسلام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بوساطت حضور نبی اکرمؐ عطا فرمایا، اور جو قرآن مجید کے اندر محفوظ ہے۔ اس کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ ..... صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ ..... (۶/۱۱۶)۔ دین کے اصول و ضوابط مکمل ہو گئے اس لئے ان میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ وہ غیر متبدل ہیں۔

۲۔ اس کے بعد محدثین نے کہا کہ اسلام، احادیث کے ساتھ مل کر مکمل ہوتا ہے۔ انہوں نے احادیث کو جمع و مدوّن کیا۔ انہیں چھان پھٹک کر ان کے مدارج مقرر کئے اور کہا کہ صحیح احادیث میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ بخاری کی اور مسلم کی ایک حدیث کے انکار سے مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان کے عقیدہ کی رُو سے بھی دین غیر متبدل قرار دیا گیا۔

۳۔ پھر فقہا حضرات نے فقہیں مرتب کیں۔ اگرچہ ان کی ترتیب و تدوین کے زمانے میں ان میں ردّ و بدل ہوتا رہا لیکن اس کے بعد انہوں نے بھی یہ مسلک اختیار کیا کہ مسلّمہ فقہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

۴۔ لیکن ہمارے زمانے میں ایک اسلام وضع کیا گیا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ضرورت اور مصلحت کے مطابق تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے لئے قرآن، حدیث، فقہ میں سے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ سند صرف یہ ہے کہ "ہم نے جو کہہ دیا"۔ اس اسلام کی دو چار جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ پارٹی سازی

سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) ۱۹۳۷ء میں حیدر آباد (دکن) سے منتقل ہو کر شمالی ہند (دار الاسلام) آئے تو ان کی کوئی پارٹی نہیں تھی۔ وہ ایک ماہنامہ (ترجمان القرآن) کے مدیر کی حیثیت سے متعارف تھے، اور وہ بھی بیشتر اسی علاقہ میں۔ شمالی ہند میں لوگ بہت کم ان سے متعارف تھے۔ جو حضرات ان سے متعارف تھے وہ بھی اس بہت سے کہ وہ اپنے رسالہ میں علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ تصورِ اسلام اور اسلامی مملکت کی تائید کرتے تھے۔ لیکن یہاں پہنچنے کے بعد انہوں نے اپنا روپ بدل لیا۔ قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کی تنظیم نو سے اسے ایک مستحکم پارٹی کی حیثیت سے قائم کیا تو مودودی (مرحوم) نے فرمایا کہ مسلمانوں میں الگ الگ پارٹیاں اسلام کی رو سے جائز نہیں۔ انہوں نے ماہنامہ پیامِ حق کی فروری ۱۹۳۸ء

کی اشاعت میں ایک طویل مقالہ[1] کے دوران لکھا:۔

یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا، مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتیں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔

اس کے بعد دو تین سال میں ان کی پوزیشن قدرے مستحکم ہو گئی تو انہوں نے اگست ۱۹۴۱ء میں خود اپنی پارٹی قائم کر لی جس کا نام "جماعت اسلامی" رکھا گیا۔ اس میں جماعت کے ساتھ "اسلامی" کا لاحقہ یونہی رسمی نہیں تھا۔ اس کی تہ میں ایک اہم نکتہ پنہاں تھا جس کا انکشاف مودودی (مرحوم) نے اپنے اس مقالہ میں فرمایا جو اس جماعت کے ترجمان، ایشیا کی ۱۴ مارچ ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ

جو لوگ ایک ہی عقیدہ، ایک ہی نصب العین، اور ایک ہی مقصد رکھتے ہوں ان کے لئے ایک جماعت بن جانے کے سوا چارہ نہیں۔ اور ان کا ایک جماعت بن جانا بالکل ایک فطری امر ہے۔ وحدتِ کلمہ کا لازمی نتیجہ اتحاد و اجتماع ہے اور افتراق اس جگہ ہوتا ہے جہاں کلمہ متفرق ہو۔

یعنی مودودی (مرحوم) نے پہلے کہا تھا کہ مسلمان خود ایک جمعیت ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کلمہ کے اشتراک کی بنا پر ہی ایک جمعیت تھے جس کے اندر جماعتیں بنانا خلاف اسلام تھا۔ اب اس جمعیت کے اندر سے ایسے لوگوں کو چنا گیا تھا جن کا کلمہ مشترک تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کلمہ بہرحال دیگر مسلمانوں کے کلمہ سے الگ ہو گا جبھی تو یہ ایک الگ پارٹی بنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مودودی (مرحوم) نے اپنی جماعت کے اراکین کو متنبہ کر دیا تھا کہ

جماعت کے اندر جماعت بنانے کی کوشش بھی نہ کی جائے (ایضاً)

ملک میں سیاسی تقاضوں کے ساتھ ساتھ، ان حضرات کے نزدیک سیاسی پارٹیوں کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی کہ جب (۱۹۷۷ء میں) ملک میں یہ آواز ابھری کہ سیاسی پارٹیوں کو معطل یا محدود کر دیا جائے تو اس کے خلاف سب سے پہلے انہی حضرات کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ چنانچہ (اس وقت) کالعدم جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے فرمایا کہ

ملک میں سیاسی جماعتوں کو معطل کرنے اور محدود کرنے کی تجویز ملک کے ساتھ بے انصافی ہے.....
اگر یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو چند ماہ کے دوران سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔

(نوائے وقت۔ ۱۱ جون ۱۹۷۸ء)

آپ غور فرمائیے کہ امت میں پارٹیوں کو ممنوع قرار دینا بھی اسلام تھا، اور اس کے بعد یہ بھی اسلام!

---

[1] یہ مقالہ بعد میں مودودی (مرحوم) کی کتاب "مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ اول" میں شامل کر دیا گیا تھا۔

پارلیمان میں پارٹیاں

اور آگے بڑھیئے۔ سوال پیدا ہوا کہ پارلیمان میں الگ الگ پارٹیاں بنانا جائز ہوگا یا نہیں۔ مودودی (مرحوم) نے فرمایا کہ

> مجالسِ قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بہتر سے بہتر نمائندے منتخب کرانے کے لئے انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں مگر منتخب ہوجانے کے بعد ارکانِ مجلس قانون ساز کو پارٹیوں کی وفاداری سے آزاد ہوکر اپنے ضمیر و ایمان کے مطابق اپنے فیصلے انجام دینے چاہئیں۔ (دستوری تجاویز۔ ص ۱۴)

اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ

> جماعتِ اسلامی نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنی پارلیمانی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہر اسمبلی میں پارلیمانی پارٹی قائم کرنے کی ہدایت کی جائے۔
>
> (کوہستان ۱۰ اگست ۱۹۷۲ء)

اور ۱۹۷۰ء میں فیصلہ کیا گیا کہ

> صوبائی اور نیشنل اسمبلیوں میں جماعتِ اسلامی کی پارلیمانی پارٹی حسبِ ذیل اصول پر کام کرے گی۔
>
> (جماعت اسلامی کا منشور بحوالہ طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۷۰ء)

وہ بھی اسلام .... یہ بھی اسلام!

انتخابات

پارلیمان کا ذکر آیا تو کچھ قصہ انتخابات کا بھی سن لیجئے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد جماعتِ اسلامی ابھر آگئی تو وہ کمزور سی جماعت تھی۔ دوسرے، وہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی وجہ سے عوام کی نگاہوں میں ملعون بھی تھی۔ ان حالات میں ۵۱-۱۹۵۰ء کے انتخابات کا زمانہ آیا تو مودودی (مرحوم) نے کہا:-

> اب ہم کو اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندہ کیا ہے ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعتِ اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعتِ اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں، بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار

بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔

(بحوالہ جماعتِ اسلامی کی انتخابی "جدوجہد" مطبوعہ ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۵۰ء)

مودودی (مرحوم) کے نزدیک یہ فیصلہ کس قدر اسلام کی اساسات میں سے تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ اگر اسلام کی یہی تعلیم ہے تو پھر اس کا کیا جواب ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو خلافت کے اُمیدوار کی حیثیت سے پیش فرمایا تھا۔ اس کے جواب میں مودودی (مرحوم) نے فرمایا:۔

آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف، تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

یعنی مودودی (مرحوم) کے نزدیک اسلام کا یہ اصول اس قدر محکم تھا کہ اس کے خلاف حضرت علیؓ کے فیصلے کو بھی ان کی لغزش قرار دیا گیا۔

چند سال بعد، ۱۹۵۸ء کے انتخابات کے زمانہ میں، جماعتِ اسلامی کی پوزیشن قدرے بہتر ہو گئی اس لئے اس سلسلے میں مودودی (مرحوم) نے اپنے سابقہ فیصلہ میں حسب ذیل ترمیم فرمائی:۔

جماعتِ اسلامی نے ۵۱-۱۹۵۰ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اس لئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں ..... اس بنا پر ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیر کر دیا ہے کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو رفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہوگی انہیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۲۳)

اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی فرما دیا کہ

ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کریگا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور

اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی (مرحوم) کی پہلی پالیسی بھی، ان کے بیان کے مطابق، عین مطابق اسلام تھی، اور اب یہ تبدیل شدہ پالیسی بھی عین مطابق اسلام، یہ الگ بات تھی کہ یہ چیز جماعت اسلامی کے بہت سے اکابرین کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ جماعت سے الگ ہو گئے کہ اس قسم کی اصول شکنی تو کبھی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

اس کے بعد (کالعدم) جماعت اسلامی نے ہر انتخاب میں حصہ لیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے سلسلہ میں اس "اسلامی خدمت" کے لئے، جماعت کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے چندے کی بھی اپیل کی۔ انہوں نے کہا:۔

حالیہ انتخابات عام میں قومی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں جماعت اسلامی ملک کی دوسری حزب اختلاف کی جماعتوں کے ساتھ متحد ہو کر اپنے حصے کے نمائندے کھڑے کر رہی ہے۔ لیکن جماعت اور اس کے کارکنوں سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ جماعت کے پاس مخلص، محنتی، دیانتدار اور فرض شناس افراد اور کارکن تو بہت موجود ہیں لیکن ان میں سے اکثر متوسط اور غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے انتخابات کے اخراجات کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں ایک ایک حلقہ انتخاب کے لئے اخراجات کا جو اندازہ قانون میں رکھا گیا ہے اور جو سرکاری پارٹی اور عام امیدواروں کے اخراجات کا شائد چند فی صد ہوگا۔ اس کے حساب سے بھی لاکھوں روپے کی ضرورت ہے اس لئے میں ملک کے تمام باشندوں سے خواہ وہ پاکستان کے اندر ہیں یا باہر، اپیل کرتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک اور جلد از جلد جماعت کی مالی معاونت فرمائیں اور جماعت اور اس کی حلیف حزب اختلاف کی جماعتوں یعنی پاکستان قومی اتحاد کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے امیدواروں کو اپنا ووٹ دے اور دلوا کر کامیاب بنانے کی بھی پوری کوشش کریں۔ (ایشیا۔ بابت ۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء۔ صفحہ اوّل)

ان انتخابات میں، اقامت دین کی اس مدعی جماعت نے کیا کچھ کیا، اس کے متعلق، اس جماعت کے ایک نہایت ذمہ دار (سابقہ) رکن (سید وصی مظہر ندوی) کا وہ خط قارئین کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ جو انہوں نے ماہنامہ میثاق کی محرم الحرام۔ صفر ۱۴۰۳ھ کی اشاعت میں شائع کیا تھا۔ یہ خط ہم نے طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۸۳ء میں شائع کیا تھا لیکن موضوع کی نسبت سے اسے دوبارہ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

پھر کارکنوں کو بھی انتخابی ہتھکنڈوں میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی چلی گئی۔ ابتداءً تحریک اسلامی کے کارکنوں کی حیثیت سے ان کو ہر غلط طریقہ اختیار کرنے میں جھجک محسوس ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ "نظریہ ضرورت" و "غایت کی صحت" اور تحریک کے اندر اور باہر کے مخالفوں کو خاموش کر دینے کی غرض سے ایک دفعہ کامیاب ہو کر دکھا دینے کے جذبہ نے ہر غلط طریقہ کو جائز کر لینے پر آمادہ کر لیا۔

پنجاب کے پہلے صوبائی انتخابات میں اصول پرستی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص خود رضاکارانہ جعلی ووٹ ڈالنا چاہتا تو کارکن اس کو سختی کے ساتھ منع کرتے لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جعلی ووٹ رہنماؤں کے علم میں ڈالے گئے، مگر انہوں نے اس قسم کی حرکتیں کرنے والوں کو نہ صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ کسی درجہ میں ان کی طرف سے حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ پھر ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں نوبت اس حد تک جا پہنچی کہ ذمہ دار

ارکان نے سیاہی مٹانے والے لوشن ایجاد کر کے ان کو استعمال کیا اور تحریک کے علم میں ہونے کے باوجود ان لوگوں کا کوئی احتساب نہ کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں نعرے، تقریریں، الزامات، حرکات و سکنات غرض ہر پہلو سے تحریک اسلامی کے کارکن ماشاءاللہ ایک دنیادار سیاسی پارٹی کی سطح پر آ چکے تھے بیگمات کے خلاف غیر مہذب نعرے، بھنگڑا ناچ، بے پردہ خواتین کے جلوسوں کی قیادت، توڑ پھوڑ کی اسکیموں میں رہنمائی، جلسوں اور جلوسوں کی ہما ہمی میں نمازوں سے بے نیازی، غرض یہ کہ یہ سب کچھ جائز بلکہ مستحسن ٹھہرا لیا گیا۔

ویٹو کا حق

سوال پیدا ہوا کہ ملک کا نظام پارلیمانی ہو یا صدارتی۔ پارلیمانی نظام میں فیصلے اکثریت کے ہوتے ہیں۔ صدارتی نظام میں پریذیڈنٹ کو ویٹو کا حق حاصل ہوتا ہے۔ مودودی (مرحوم) نے اپنی جماعت کے سلسلہ میں اسلام کی رو سے فرمایا تھا کہ

جب امیر کو چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سپید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام، تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (پمفلٹ۔ اسلام کا نظریہ سیاسی ص ۴۵-۴۴)

دوسرے مقام پر کہا:-

امیر مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلے میں ویٹو کا استعمال کر سکے گا۔ (ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۳)

ایک اور جگہ اسے ان الفاظ میں دہرایا:-

امیر کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔ (اردو دستوری خاکہ ص ۲۸)

اس کے بعد، صدر ایوب کے زمانہ میں، نظام حکومت صدارتی قرار پایا تو مودودی (مرحوم) نے اس کے خلاف حسب ذیل فتویٰ صادر فرما دیا:-

جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے یا جسے ان کی جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ دے دینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت

کے ساتھ جو بات طے ہو اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔ (ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۶۵ء)

عورت اور سیاست

(مرحوم) صدر ایوب کے زمانے میں جب محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) منصب صدارت کے لئے بطور امیدوار کھڑی ہوئی تھیں تو اس سوال نے بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی کہ اسلام کی رو سے عورت کو اس طرح سیاست میں حصّہ لینے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ مودودی (مرحوم) اس سے پہلے اس سوال کا جواب ہدیں الفاظ دے چکے تھے۔

مجلسِ دستور ساز کی رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی نقالی ہے۔ اسلام کے اصول اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظامِ ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے اور یہ فرائض عورتوں کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔ (دستوری تجاویز)

ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں تحریر فرمایا:۔

کیا اللہ کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ گھر میں تو عورت کو قوّام نہ بنائے گا لیکن کئی لاکھ گھروں کے مجموعہ (یعنی مملکت) پر اس کو قوّام بنا دے گا۔

لیکن مودودی (مرحوم) اور جماعت اسلامی نے محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی تائید کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب مودودی (مرحوم) پر یہ اعتراض کیا گیا تو انہوں نے:

چیلنج کیا کہ کوئی شخص یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شرع عورت کا سربراہ مملکت ہونا قطعی حرام ہے اور اس سلسلہ میں استثناء کی قطعی گنجائش نہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت لوگوں کو مذہب کے نام پر گمراہ کر رہی ہے۔ (روزنامہ مشرق۔ مورخہ ۱۲/۱/۶۴)

پیشۂ وکالت

مودودی (مرحوم) نے تقسیم ہند سے قبل، پیشۂ وکالت کے متعلق ایک وکیل کے استفسار کے جواب میں، اسلام کا نقطۂ نظر یوں بیان فرمایا تھا:۔

اپنے پیشے کے متعلق آپ نے جو رائے قائم کی ہے سو فی صدی صحیح ہے اور آپ کی سلامتِ طبع پر دلالت کرتی ہے۔ آپ جیسے سلیم الطبع لوگوں کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ ایک کافرانہ نظام جب کلی طور سے کسی سرزمین پر چھا چکا ہوتا ہے تو اس کے ماتحت رہتے ہوئے کسی شخص کا خالص حلال رزق حاصل کرنا اور مطابقِ شرع زندگی بسر کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ زیادہ حرام سے بچکر کم حرام اور ناگزیر حرام کو برداشت کیا جائے اور بغاوت سے بچکر ایسی معیشت کو مجبوراً گوارا کیا جائے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے

مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہرحال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور وہ کم از کم، اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جنوری فروری ۱۹۴۴ء صفحہ ۸۳ تا ۸۶)

انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ "وکیل کے منشی کا کام بھی حرام ہے"۔ (ایضاً)

اس کے بعد جب یہاں آکر دیکھا گیا کہ وکلاء حضرات کی تائید ناگزیر ہے تو میاں طفیل محمد صاحب نے ۱۸ مارچ ۱۹۶۷ء کو ساہیوال بار کونسل میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

آپ کا تعلق ایک ایسے طبقے سے ہے جو ملک و قوم میں اپنی خدمات کے لحاظ سے ایک اونچا مقام رکھتا ہے۔ مسلمانوں کی لیڈرشپ ہمیشہ ماہرین قانون کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، امام یوسفؒ (رحمۃ اللہ تعالیٰ اجمعین) سب ماہر قانون ہی تو تھے اور مسلم معاشرے کے نباض کی حیثیت سے ان کی راہ نمائی پر کامل اعتماد کیا جاتا تھا۔ آج آپ بھی اسی مسند پر بیٹھے ہوئے قوم کو اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ آپ کے کاندھوں پر ایک زبردست ذمہ داری کا بوجھ ہے جسے انتھک لگن اور مسلسل کاوش سے ہی آپ اٹھا سکتے ہیں۔

کہا جائے گا کہ مودودی (مرحوم) نے وہ کچھ "باطل نظام" میں پیشۂ وکالت کے متعلق کہا تھا اور میاں صاحب نے یہ کچھ پاکستان میں کیا ہے جہاں "اسلامی نظام" رائج ہے۔ سو گزارش ہے کہ میاں صاحب (۱۹۶۷ء میں تو ایک طرف) اب بھی اسے تسلیم نہیں کرتے کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہے۔ انہوں نے ابھی اگلے دنوں کہا ہے کہ پاکستان تو ایک طرف، دنیا کے کسی ملک میں بھی اسلامی نظام نافذ نہیں۔ (اب اس میں سعودی عرب کی استثناء کر لی گئی ہے)

معاشی نظام

اس وقت دنیا میں معاشی نظام کو جس قدر اہمیت حاصل ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اقوام عالم بالعموم اور مسلمان بالخصوص یہ معلوم کرنے کے لئے بیحد متشوش ہیں کہ اسلام کا اس باب میں کیا مسلک ہے۔ طلوع اسلام اس موضوع پر گزشتہ پینتیس سال سے (قریب قریب متواتر) لکھتا چلا آرہا ہے۔ اس ضمن میں مودودی (مرحوم) کا مسلک بھی متعدد بار ان صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ہم اس تکرار کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہیں لیکن موضوع زیر نظر کا تقاضا ہے کہ (کم از کم) اس کا ملخص دہرا دیا جائے۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب "مسئلہ ملکیت" میں لکھا تھا کہ

۱۔ زمین کی ملکیت کے رقبہ کو محدود کرنا۔ اور ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینے کا تخیل بنیادی طور پر جو اسلام کے نقطۂ نظر کی مخالف ہے۔ اور

۴۔ اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔

۱۹۷۰ء کے الیکشن کے سلسلہ میں (کالعدم) پیپلز پارٹی نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور صنعتی ادارے اور دیگر اسی قسم کی تنصیبات بھی قوم کی تحویل میں ہونی چاہئیں۔ اس نعرہ میں اس قدر کشش تھی کہ لوگ جوق در جوق اس پارٹی کی طرف جانے شروع ہو گئے۔ جب مودودی (مرحوم) نے دیکھا کہ اس طرح ان کی جماعت کو انتخابات میں شکست ہو جائے گی تو انہوں نے رنگ بدلا اور اپنے "انتخابی منشور" میں لکھا:

قدیم املاک کے معاملہ میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائے گا۔

صنعتوں کے قومیانے کے متعلق کہا:

ہم قومی ملکیت کے نظام کو بطور اصول اختیار کرنے کے مخالف ہیں لیکن جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے اور جن کا نجی حیثیت سے چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے، انہیں قومی ملکیت میں بمعاوضہ لے لینے یا خود حکومت کے انتظام میں قائم کرنے اور چلانے کو ناجائز نہیں سمجھتے۔

یعنی "جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا تھا" وہ اب اسلام کی رُو سے ناجائز نہیں رہا۔

یہ ہیں چند ایک جھلکیاں اُس "ضرورت کے مطابق بدلنے والے اسلام" کی جسے یہ حضرات اقامتِ دین کے نام سے پاکستان میں پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اگر اسلام نافذ کرنے کے اختیارات اس قسم کی جماعت کے ہاتھ میں آجائیں تو یہاں کس قسم کا اسلام نافذ ہوگا؟ جب قرآن نے کہا کہ یہ ہیں وہ احکام جن کی اطاعت مقصود ہے اور ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی، تو اس سے انسان کو کس قدر اطمینان ہو جاتا ہے۔ لیکن جب صورت یہ ہو کہ کوئی کہہ ہی نہ سکے کہ کل کو کونسا اسلام نافذ ہو جائے گا تو اس سے انسان کے امن و اطمینان کی کیفیت کیا ہوگی۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ نظریہ ضرورت کے تحت بدلنے والے "اسلام" کا اثر انسان کے کردار پر بھی پڑتا ہے اس کی ایک مثال اس جماعت کی مجلس شوریٰ کے اس اجلاس میں سامنے آئی تھی جو ۱۹۵۶ء میں منعقد ہوا تھا اور جس کے نتیجہ میں جماعت کے متعدد اکابرین جماعت سے الگ ہو گئے تھے۔ ان میں رئیس فیصل آباد کے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب بھی تھے جنہوں نے اس کی روئداد اپنے ہفتہ وار اخبار المنبر کی ۷ر اور ۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شائع کی تھی۔ آپ اسے انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

۱۹۵۶ء کی معرکۃ الآرا شوریٰ جماعت اسلامی جس میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ زیر بحث آئی اس رپورٹ میں متعدد ارکانِ جماعت کی جانب سے یہ الزام سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) پر لگایا گیا تھا کہ مولانا مودودی (مرحوم) نے تحریکِ اسلامی کے محرکِ اول اور جماعت اسلامی کے بانی و امیر کی حیثیت سے یہ تصور پیش کیا تھا کہ موجودہ تعلیم گاہیں قتل گاہیں ہیں اس لئے ان میں اپنے بچوں کو داخل کرنا انہیں قتل کر دینے کے مترادف ہے۔

چنانچہ مولانا کی اس زوردار تنقید سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی کے متعدد کارکنوں اور

ارکان نے اپنی اولاد کو مروّجہ تعلیم سے محروم رکھا۔ اور ان میں سے بعض ایسے افراد بھی تھے جن کی اولاد کا اس تعلیم سے محروم رہ جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی برادری میں "نکّو" بنادیں اور ان کے رشتوں ناطوں تک کا معاملہ مخدوش ہو کر رہ جائے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس تنقید اور مسلمانوں کو موجودہ تعلیم گاہوں سے اپنی اولادوں کو اٹھا لینے کی دعوت کے بعد خود امیر جماعت نے اپنے لڑکوں کو انہی کالجوں میں داخل کرایا۔ یہی اقدام ناقابلِ تصوّر تھا مگر جب ارکانِ جماعت نے یہ سنا کہ مولانا مودودی (مرحوم) نے اپنی بچیوں کو بھی کالجوں میں داخل کرا دیا ہے تو ارکانِ جماعت کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ اگر خود داعی ہی اپنی دعوت کے پرخچے اڑانے لگے تو اس کی حفاظت کون کرے گا۔

(ہفتہ وار المنبر۔ فیصل آباد ۷-۱۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے اس الزام کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک ظالم باپ بننے اور ایک داعی کی حیثیت سے اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھنے کا، اور دوسرا راستہ اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا۔۔ اگر میں اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھتا تو خود میری اولاد مجھے "ظالم باپ" کہتی۔ اس صورت میں ایک بعض لوگوں کے تصوّر کے مطابق داعی کی حیثیت سے اپنی بات پر عمل پیرا تو ہو جاتا مگر "ظالم باپ" ضرور بنتا۔ اور اپنی اولاد کو پست معیار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتا اور جہاں تک بس چلتا اس کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کرتا۔ سو میں نے اسی کو ترجیح دی۔ (ایضاً)

اسی اخبار میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ حکیم صاحب سے ایک صاحب نے سوال کیا تھا کہ

مجلسِ شوریٰ میں مودودی (مرحوم) کے اس جواب پر اراکینِ مجلس کا ردِعمل کیا تھا۔ وہ مودودی صاحب کے اس جواب کے خلاف اٹھ کیوں نہ کھڑے ہوئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ حضرات مودودی صاحب کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے۔ اس وقت اراکینِ جماعت کی کل تعداد تیرہ سو تھی، اور ان میں ایک سو بیس ارکان مودودی صاحب کے تنخواہ دار ملازم تھے یعنی ہر گیارھواں رکن جماعت سے تنخواہ پاتا تھا۔

اس واقعہ کے نقل کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ انسان کے سامنے اسلام کا جس قسم کا تصوّر ہو، اسی قسم کا اس کا کردار ہو جاتا ہے۔ نظریہ ضرورت کے تحت ہر مصلحت کے مطابق بدل جانے والے "اسلام" کا انسانی سیرت و کردار پر اسی قسم کا اثر مرتّب ہوگا۔ اس قسم کے فرمودات کہ "زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔" یا مصلحت کے تحت "اصول بھی بلا تکلّف توڑے جا سکتے ہیں" اسی اسلام کے شاخسانے ہیں جس کی مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ مودودی (مرحوم) نے جو کچھ کہا ہے اس کے لئے کسی سند (اتھارٹی) کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس لئے کہ میاں طفیل محمد صاحب کے بیان کی رو سے:

مولانا مودودی (مرحوم) اس زمانے میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے۔ اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے۔ اور سند ہیں۔ (رفاقت کشمیر نمبر بحوالہ ماہنامہ الفرقان۔ بابت مئی۔ جون ۱۹۵۵ء)

جو اسلام ہر مصلحت کے تابع بدلتا رہے، اور اس کی سند، اس اسلام کے پیش کرنے والے کی اپنی ہستی ہو، اس کے جو نتائج مرتّب ہو سکتے ہیں ظاہر ہے۔ اسلام کے نام پر اس سے بدتر آمریت کوئی اور ہو نہیں سکتی، بالخصوص جب ان سے اختلاف "ارتداد" قرار دیا جائے، اور اس کی سزا (مودودی مرحوم کے فیصلہ کی رو سے) موت ہو!

یہ مقالہ جون ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں
آنا چاہیئے تھا۔ سہواً رہ گیا۔

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کے مہینہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس لئے (معمول کے مطابق) قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ احکام سورۂ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

(۲) اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ۔

(۴) اور جو لوگ بہ دشواری روزے رکھ سکیں، ان کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۵) فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

(۵) اس کے بعد اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کر لے تو مزید اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔

(۶) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

ط ان احکام کو اس سے پہلے بھی ہم کئی بار درج کر چکے ہیں۔ لیکن قارئین کے تقاضے کے پیشِ نظر انہیں دہرایا جا رہا ہے۔

(۷) فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔ (۲/۱۸۵)

(۷) لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔

(۸) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ۔ (۲/۱۸۷)

(۸) اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ۔ (۲/۱۸۷)

(۹) اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

۱۔ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں، بلکہ پورے مہینے کے)۔

۲۔ روزے میں، اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک، کھانا، پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

۳۔ روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

۴۔ اب ایک مشکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے، اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں۔ لیکن بڑھاپے یا کسی مزمن مرض کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے کہ اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ کا ترجمہ ـــــ وہ لوگ جو بہ دشواری روزہ رکھ سکیں ـــــ کیا ہے۔ لیکن اس کا عام ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ـــــ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو وہ روزے رکھا

کریں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اُردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم صفحہ ۱۳۰۴ میں ہے۔

"طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں جیسے انسان بہ مشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اُس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے: لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔"

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۱۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ

طاقت، قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہ، اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ

اِطَاقَة" دراصل مکنت اور قدرت کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّیْءَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی بہ دشواری اُسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ یُطِیْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو انہیں کی طرح معذور ہیں۔ یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ اسی بنا پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لیے بہ مشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ

طَاقَة کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے، منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف صفحہ ۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں اَلْوُسْعَ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَة کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا، (آیۂ زیرِ نظر) کے معنی یہ ہوں گے۔ اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔

(روح المعانی صفحہ ۵۹، جلد ۲)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَة" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ —— اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں —— صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ —— جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اُسے اُمت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے۔ چنانچہ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ، میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو یہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" (صفحہ ۲۶۸ - ۲۶۹ - جلد ۲) میں ہے کہ

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں، ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے۔ اور حضرت انسؓ، ابن عباسؓ، قیسؓ بن السائب اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ـــــ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے، قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہونگے جو مزدوری پیشہ ہوں۔ جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں، اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دُور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو، روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو، ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے۔ جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت، ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار۔ صفحہ ۱۵۵ - ۱۵۷ - جلد ۲)

یہ ہیں روزوں کے احکام قرآنِ کریم کی رُو سے۔ ہم نے صرف احکام سے بحث کی ہے۔ روزے کا فلسفہ بیان نہیں کیا۔ وہ الگ موضوع ہے۔

(۰)

حقائق و عبر

بادشاہت اور اسلام

(کالعدم) جماعت اسلامی کے امیر میاں محمد طفیل صاحب نے اگلے دنوں، ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے، ایک سوال کے جواب میں کہا کہ

> سعودی عرب کے علاوہ کسی جگہ بھی مکمل اسلامی نظام نافذ نہیں۔ سعودی عرب میں بھی بادشاہت ہے لیکن سعودی عرب میں دیوانی اور فوجداری مقدمات کے سلسلہ میں شرعی قوانین نافذ ہیں۔ اس لئے سعودی عرب میں پاکستانی افراد کی فوجداری اور دیوانی مقدمات کے سلسلہ میں قاضیوں کی تربیت حاصل کرنا درست ہے۔

میاں صاحب نے فرمایا ہے کہ اس وقت تمام عالم اسلام میں صرف سعودی عرب ایسا ملک ہے جہاں مکمل اسلامی نظام نافذ ہے۔ باقی رہا یہ کہ وہاں بادشاہت ہے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بادشاہت کے ساتھ بھی مکمل اسلامی نظام نافذ ہو سکتا ہے۔

سعودی عرب کے حکمرانوں کے متعلق مودودی (مرحوم) کیا فرمایا کرتے تھے[1] اور ان کے ساتھ رابطہ قائم ہونے کے بعد انہوں نے اس میں کیا تبدیلی کی تھی۔ اس موضوع پر ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے کیونکہ یہ معاملات نازک سے ہیں۔ لیکن میاں صاحب نے جو فرمایا ہے کہ بادشاہت سے اسلام پر کچھ اثر نہیں پڑتا، اس پر خاموش رہنا ہمارے نزدیک بارگاہ خداوندی میں جرم عظیم ہوگا۔ اس موضوع پر ہم چاہتے تو ایک کتاب لکھ سکتے تھے لیکن میاں صاحب کے لئے، ہمارے خیال میں اتنا ہی کافی ہوگا اگر یہ بتا دیا جائے کہ مودودی (مرحوم) نے اس بارے میں کیا کہا تھا۔ ان کی ایک مستقل اور مبسوط تصنیف ہے "خلافت و ملوکیت"۔ اس میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کے دور خلافت سے بات شروع کر کے، یزید کی ولی عہدی تک تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> اس طرح خلافت راشدہ کے نظام کا آخری اور قطعی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ خلافت کی جگہ شاہی خاندان (DYNASTIES) نے لے لی اور مسلمانوں کو اس کے بعد سے آج تک پھر اپنی مرضی کی خلافت نصیب نہ ہو سکی۔
>
> (ص ۱۵۳)

---

[1] ملاحظہ ہو ان کی کتاب "خطبات" میں حج کا عنوان۔

اس سے بہت پہلے انہوں نے "تجدید و احیائے دین" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جس میں بتایا تھا کہ کسطرح حضرت عثمانؓ کے دور ہی میں، ملوکیت کی پرچھائیاں، اسلامی نظام پر پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ اس دور میں اسلام کی رفتار تو تیز ہو گئی لیکن

دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش روؤں کو عطا ہوئی تھیں۔ اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دے کر اس خطرے کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رُکا۔ ان کے بعد حضرت علیؓ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر ان کی جان کی قربانی بھی اس انقلاب معکوس (COUNTIR REVOLUTION) کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علیٰ منہاج نبوت کا دور ختم ہو گیا۔ ملک عضوض (TYRANT KINGDOM) نے اسکی جگہ لے لی اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۴۰ء۔ جنوری ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۳۵)

"جاہلیت" زمانۂ قبل از اسلام کے کافرانہ نظام کو کہتے ہیں۔ مودودی (مرحوم) نے کہا ہے کہ بادشاہت سے اسلام کے نظامِ حکومت کی بنیاد ہی الٹ گئی۔

اس کے بعد انہوں نے واضح تر الفاظ میں لکھا تھا:

جاہلیت خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا۔ نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ (صفحہ ۳۶)

یعنی مودودی (مرحوم) نے کہا تھا کہ بادشاہی، عہدِ جاہلیت کا نظام تھا جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، اور میاں صاحب فرماتے ہیں کہ مکمل اسلامی نظام اور بادشاہی، دونوں یک جا رہ سکتے ہیں! وہ بھی اسلام تھا۔ یہ بھی اسلام ہے۔

۲۔ یورپی اور افریقی ممالک میں تبلیغِ اسلام

روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۱۳ جون ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں حسب ذیل خبر چھپی ہے۔

ورلڈ اسلامک مشن کے صدر مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا ہے کہ مسلم حکومتوں کو یورپ اور افریقہ کے ملکوں میں اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے تبلیغِ اسلام کی غرض سے مشترکہ فنڈ قائم کرنا چاہئے۔ انہوں نے ڈربن کالونی کے دارالعلوم قادریہ سبحانیہ میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ بعض مسلم ملکوں کے حکمران یورپی ملکوں میں اربوں ڈالر سے عمارتیں تعمیر کرتے ہیں اور یہودیوں کو سرمایہ فراہم کر رہے ہیں لیکن تبلیغِ اسلام کے لئے اتنا کام نہیں ہو رہا جتنا صحیح معنوں میں ہونا چاہیے۔

تبلیغ اسلام ملتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے، اور اس سمت میں جو صحیح قدم بھی اٹھے مستحق تبریک و تہنیت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ مسلم ممالک میں اسلام کا بول بالا ہو چکا ہے جو یورپی اور افریقی ممالک میں اس کی ضرورت پیش آ گئی ہے؟ بقول سعدی

تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ بر آسماں نیز پرداختی؟

حقیقت یہ ہے کہ اگر موجودہ مسلم ممالک میں سے کسی ایک میں بھی اس اسلام کا بول بالا ہو جائے جسے خدا نے ہمارے لئے پسند فرمایا تھا تو

تو اس کے انسانیت ساز نتائج دیکھ کر (قرآن کے الفاظ میں) اقوام عالم فوج در فوج اس کی طرف لپک کر آجائیں گی۔ یہ ہو گا تبلیغ اسلام کا صحیح طریق؛

پھر یہ سوال بھی قابلِ غور ہے کہ ان (یورپی اور افریقی ممالک میں) کونسا اسلام پھیلایا جائیگا؟ انگلینڈ میں اسلام پھیلایا تو وہاں کی مساجد کی تولیت اور امامت کے جھگڑوں میں مختلف فرقوں میں سر پھٹول ہو رہی ہے اور نوبت پولیس اور عدالتوں تک پہنچی ہے اس سے ہم اضحوکہ بن رہے ہیں اور اسلام دنیا میں بدنام ہو رہا ہے۔ سب سے پہلی ضرورت تو اسلام کے اس "ایڈیشن" کی ہے جس پر دنیا کے تمام مسلمان متفق ہوں۔ پھر اس اسلام کو بیک وقت ساری دنیا میں نہ سہی، ابتداءً کسی ایک ملک میں بحیثیت نظام نافذ کرنے کی۔ یہ ہو جائے تو غیر مسلموں میں اسلام کے راہ پانے کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

۳۔ ناجائز کس طرح جائز ہو جاتا ہے!

قارئین کو معلوم ہے کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں ایک کتاب الحیل بھی ہوتی ہے۔ اس میں ایسی ترکیبیں بتائی گئی ہوتی ہیں کہ قانون کی خلاف ورزی بھی کرو، تو سزا بھی نہ پاؤ۔ اسی سلسلہ میں اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ چوری کے جرم کی سزا سے کسطرح بچا جا سکتا ہے، اور سود کسطرح جائز قرار پا سکتا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک اور مثال ہمارے سامنے آئی ہے۔ پچھلے دنوں وکلاء حضرات نے بطور احتجاج بھوک ہڑتال کی تو بعض مفتی صاحبان نے فتویٰ صادر فرمایا کہ ایسا کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ اس پر انہی حضرات کے زمرہ میں سے ایک صاحب نے یہ گُر بتایا ہے کہ یہ اقدام کسطرح عین مطابق شریعت قرار پا سکتا ہے۔ روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۸ رجون ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہونے والی حسب ذیل خبر ملاحظہ فرمائیے۔

> بھوک ہڑتال کرنے والے وکلاء ہڑتال شروع کرنے سے پہلے روزہ کی نیت باندھ لیا کریں تو اس عمل کو شرعی طور پر جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ بات پشاور کے علماء کی مجلس عمل کے ایک رکن ڈاکٹر خدا حسین نے بھوک ہڑتال کرنے والے وکلاء کو مشورہ دیتے ہوئے کہا ہے۔ انہوں نے کہا، روزہ کا دارو مدار نیت پر ہوتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بھوک ہڑتالی "شام کے وقت" ایک گھونٹ پانی سے روزہ کھول لیں تاکہ روزے کی شرعی حیثیت پوری ہو جائے تو یہ بھوک ہڑتال خلافِ شریعت عمل قرار نہیں پائے گی۔

اب تو وکلاء حضرات کی بھوک ہڑتال ختم ہو گئی۔ بہرحال جن حضرات نے کبھی بھوک ہڑتال کرنی ہو وہ اس نسخۂ کیمیا کو گرہ میں باندھ کر رکھ لیں کہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔

۴۔ قرآن مجید کی برکات

ایک تفسیر میں سورۃ الروم کے خواص کے سلسلہ میں لکھا ہے:

> اگر اس سورہ کو لکھ کر کسی گھر میں رکھا جائے تو اس گھر کے سب افراد بیمار ہو جائیں گے اور اگر کوئی مہمان آئیگا تو وہ بھی بیمار پڑ جائیگا۔ اور اگر اس کو لکھ کر بارش کے پانی سے دھو دیا جائے اور مٹی کے برتن میں رکھا جائے، پھر جو بھی اس پانی کو پئیگا بیمار ہو گا۔ اور جو شخص اس پانی سے اپنا منہ دھوئیگا اس کی آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔

غنیمت ہے کہ یہ خاصیت "لکھی ہوئی" سورۃ کی ہے۔ اگر پڑھی ہوئی کی بھی یہی "برکت" ہوتی تو مسلمانوں کا کوئی گھر بھی بیماری سے محفوظ نہ رہتا۔ یہ اس قوم پر خدا کا خاص فضل ہے۔ فَبِاَیِّ "اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ"!